“SADIQA NAWAB SAHER KI FICTION NIGARI”

A dissertation submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of the requirement of the award of degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

IN URDU

Submitted

By

SHAIK MASTAN VALI

Reg.No:17HUHL02

Under the Supervision

Of

Dr. **RAFIA BEGUM**

Department of Urdu, School of Humanities

University of Hyderabad

Hyderabad 500 046

JUNE 2019

صادقہ نواب سحر کی فکشن نگاری

(تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل، اردو)

مقالہ نگار:

شیخ مستان ولی

ریسرچ اسکالر: یونی ورسٹی آف

حیدرآباد

نگراں:

ڈاکٹر رفعیہ بیگم

اسسٹینٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

شعبۂ اردو، اسکول آف ہیومانٹیز

یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد، تلنگانہ 500046

جون 2019

Department of Urdu,
School of Humanities,
University of Hyderabad.
Hyderabad - 500 046.

DECLARATION

I, **SHAIK MASTAN VALI**, hereby declare that this dissertation entitled **"SADIQA NAWAB SAHER KI FICTION NIGARI"** submitted by me under the guidance and supervision of **Dr. RAFIA BEGUM**, is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other Institutions for award of any degree or diploma.

I hereby agree that my dissertation can be deposited in shodganga/INFLIBNET.

Date:

Name: **SHAIK MASTAN VALI**

Signature of the Student

Regd. No: 17HUHL02

CERTIFICATE

This is to certify that the Dissertation entitled **"SADIQA NAWAB SAHER KI FICTION NIGARI"** submitted by **SHAIK MASTAN VALI** bearing registration number **17HUHL02** in partial fulfillment of the requirement for the award of degree of **Master of Philosophy** in **Urdu** is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This Dissertation has not been submitted previously in part or full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma.

He has presented an article in the following conference ''**SADIQA NAWAB SAHER KI AFSANA NIGARI EK JAYEZA**'' presented in two days National Seminar on 30th &31st March, 2019. {Copy of the certificate is closed}

Signature of the Supervisor

Countersignature

Head of the Department

Dean
School of Humanities

فہرست

☆ پیش لفظ — 1 تا 3

باب اول

1۔ صادقہ نواب سحر سوانح، شخصیت و ادبی سرگرمیاں — 4 تا 21

باب دوم

2۔ صادقہ نواب سحر بحیثیت ناول نگار — 22 تا 50

باب سوم

3۔ صادقہ نواب سحر بحیثیت افسانہ نگار — 51 تا 114

باب چہارم

4۔ صادقہ نواب سحر بحیثیت ڈراما نگار — 115 تا 138

مجموعی جائزہ — 139 تا 145

کتابیات — 146 تا 149

پیش لفظ

اللہ رب العزت کے کرم اور اس کے محبوب کریم ﷺ کے صدقہ سے میرا مقالہ پائے تکمیل کو پہنچا اور میرے محبّ گرامی عزت مآب اعلیٰ مقام سید شاہ عبداللہ حسینی بادشاہ قادری صاحب کا بے حد مشکور ہوں کہ جن کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میں تعلیمی میدان میں ترقی کرر ہا ہوں۔

تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے کے بعد سب سے اہم مسئلہ موضوع کا انتخاب ہوتا ہے۔ اپنی فکشن سے دلچسپی کے باجود بھی میں کشمکش کی گھڑیوں سے دوچار ہور ہا تھا مگر میرے نگراں ڈاکٹر رفیعہ بیگم صاحبہ نے میری پریشانی کو ابر براں کی مانند حل کر دیا اور میرے مقالے کا موضوع ''صادقہ نواب سحر کی فکشن نگاری'' منتخب کیا۔

مقالہ کی تیاری اور مواد کی فراہمی یقیناً ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے لیکن میرے نگراں کی رہنمائی ور ہبری نے میرے کام کو آسان بنادیا۔ جنہوں نے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازتے ہوئے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

زیر نظر مقالہ چار ابواب میں تقسیم کیا گیا جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

باب اول : صادقہ نواب سحر کی سوانح اور شخصیت وادبی سرگرمیاں کے عنوان سے ہے جس میں صادقہ نواب سحر کی حالات زندگی، تخلیقی سرگرمیاں (اردو کے حوالے سے) ادبی سرگرمیاں، انعامات واعزازات، بیرونی ممالک، ادبی

پروگراموں میں شرکت، شخصیت پر تفصیل بحث کی گئی ہے۔

باب دوم : صادقہ نواب سحر بحیثیت ناول نگار جس میں ناول کی تعریف اور خواتین ناول نگار، ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' جس دن سے ناول کو پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم : صادقہ نواب سحر بحیثیت افسانہ نگار ہے جس میں بانو سرتاج خواتین افسانہ نگار، امیر النساء، عرفانہ تزئین شبنم، ذکیہ مشہدی، نعیمہ ضیاء الدین، ترنم ریاض، میرا گھر پیا آیا، نگار عظیم، قمر جمالی، شائستہ فاخری، خلش بے نام سی افسانوی مجموعے کو پیش کیا گیا ہے۔

باب چہارم : باب چہارم میرے مقالے کا مجموعی جائزہ ہے جس میں مقالہ کے تمام ابواب کا ذکر پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں کتابیات درج کی گئی ہیں۔

شکریہ ادا کرنا ہر طالب علم کے لیے ایک رسم ہی نہیں بلکہ اس کا اولین فرض بھی ہے۔ شکریہ کے تئیں سب سے پہلے میں اپنے شعبہ اردو کے صدر محترم پروفیسر حبیب نثار صاحب کا بیحد ممنون ومشکور ہوں جن کی رہبری اور رہنمائی میرے لیے باعث ہمت افزائی رہی۔ آپ نے مجھے تحقیقی سفر کے رموز واسرار سے نہ صرف روشناس کروایا بلکہ ہمیشہ میری ہمت افزائی بھی کی۔ اس کے علاوہ شعبہ کے دیگر اساتذہ کا بھی میں شکرگذار ہوں۔

میں اپنی نگراں ڈاکٹر رفیعہ بیگم صاحبہ کا شکرگذار ہوں کہ جنہوں نے میری مدد فرما کر مقالہ کی تکمیل تک رہنمائی کی۔

میں اپنے والد ماجد کا صمیم قلب سے احسان مند ہوں جنہوں نے مجھے گھر کی ذمہ داریوں سے فارغ البال لکھا اور اپنی پدرانہ شفقت سے نوازتے ہوئے میرے تعلیمی سفر کی ہر ممکنہ صورتحال میں کوہ گراں بن کر ہمیشہ میری کامیابی وکامرانی کے لیے کوشاں رہے۔ میں اپنی والدہ مرحومہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا گوں ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے جن کی دیرینہ خواہش کی بدولت ہی میں اس مقام تک آ پہنچا۔ اس کے علاوہ میں خاص طور پر اپنے بھائیوں جن میں شاہد بھائی' اسماعیل بھائی، شمس الدین بھائی اور بہن یاسمین کا فرداً فرداً شکریہ ادا کروں تو بھی حق ادا نہ ہوگا کیوں کہ مجھے تعلیمی میدان میں ترقی کرنے کے لیے اور مجھے منزل مقصود تک کامیابی حاصل کرنے کے لیے ان تمام کی ہر ممکن کوشش اور رہبری میرے ساتھ ساتھ ہمیشہ رہی۔ میں ان تمام کے لیے دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں اور دعا گو ہوں۔

آخر میں شعبہ اردو کے میرے تمام ریسرچ اسکالرس و جملہ احباب کا بیحد مشکور ہوں جو میرے مقالہ کی تیاری میں ہمیشہ میرے مددگار رہے۔ اللہ جل شانہ انہیں اپنے مقاصد میں کامیابی اور سلامتی عطا فرمائے۔

مقالہ نگار

شیخ مستان ولی

شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد

جون

2019

روم نمبر 320 MH-C

نارتھ کیمپس

حیدرآباد

باب اول

حالاتِ زندگی

صادقہ نواب سحر 8اپریل 1957ء کو آندھراپردیش کے صوبہ گنٹور میں پیدا ہوئیں۔ان کا حقیقی نام صادقہ آراء ہے۔ والد کا نام خواجہ میاں شیخ صاحب تھا جومحکمہ موسمیات میں انسپکٹر تھے۔سبکدوشی کے بعدموٹر پارٹس کے بزنس میان ہوئے۔ والدہ محترمہ کا نام شرف النساء تھا جو ایک دین دارخوش مزاج گھریلو خاتون تھیں۔صادقہ نواب سحرابھی صرف چار ماہ کی ہی تھیں کہ گنٹور کا علاقہ فسادات کی زد میں آ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ لوگ ممبئی کا رخ کیئے اور وہیں کے ہورہے۔صادقہ نواب سحر کی ابتدائی تعلیم انجمن اسلام طیب جی ہائی اسکول ناگپاڑہ اورامام باڑہ ممبئی سے مکمل ہوئی۔

صادقہ نواب سحر کو مذہبی قصوں کے علاوہ کہانیاں سننے کا شوق بھی بچپن سے لگا ہوا تھا۔ وہ اکثر بڑے بزرگوں کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی۔انہیں ان سے قدیم قصے سننا بہت اچھا لگتا تھا۔وہ اس بارے میں لکھتی ہیں:

> ''مجھے بچپن سے ہی بڑے بوڑھے بہت اچھے لگتے ہیں کہ ان
> کے پاس تجربات کا خزانہ ہوتا ہے۔ ہمارے پڑوس کے
> بزرگ کتابیں لے کر ہمارے گھر آتے تھے۔ وہ پڑھ نہیں
> پاتے تھے لیکن نیم حجازی کے ناول بڑے شوق سے سنتے تھے
> اور انہیں آپا سے بھی بچپن میں کہانیاں سننے کا لاڈ

کروالیا تھا''۔1؎

بچپن میں صادقہ نواب سحر کے والد صاحب اپنے تمام بچوں کو اور خصوصاً صادقہ نواب کی تعلیمی صلاحیتوں کے ساتھ لکھنے لکھانے کے ذوق وشوق کو دیکھ کر اپنی دوراندیشی کے ذریعہ انہیں چھوٹے چھوٹے عنوانات پر مضامین لکھے اور کوئی کہانی کو لکھتے تھے۔ صادقہ نواب اس بارے میں لکھتی ہیں:

''والد نے میرے شوق وذوق کی تحریک دینے کے لیے کبھی
کوئی کہانی سنائی اور اس کو اپنے طریقے سے لکھنے کو کہا اور کبھی
موضوع دیئے ''ایک لین کی کہانی لکھو''
''آج ایک پیاز کی کہانی لکھو''
''ایک کرسی ....''
اب سوچتی ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ شاید وہ ایسا کرواکر مجھے
ہر موضوع پر لکھنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔''2؎

یقیناً والدین کی دوراندیشی اور تربیت ہی کی وجہ سے بچوں کے اندر موجود صلاحیتیں نکھرتی ہیں اور آگے چلا کر اپنی شناخت قائم کرتی ہیں۔

طالب علمی کے زمانے میں رفیقہ شبنم عابدی اُن کی تاریخ کی استاد ہوا کرتی بھی جو خود بھی ایک نامور شاعرہ کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکی ہیں۔ وہ کلاس میں اپنے شاگردوں میں چھپی صلاحیتوں کو تحریک دینے کیلئے اُن سے شور وشاعری اور افسانے وغیرہ پر گفتگو بھی کرتی تھیں جس سے طالب علموں کے ذوق وشوق میں نہ صرف اضافہ ہوتا تھا بلکہ وہ کچھ نہ کچھ لکھنے، پڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

1974ء میں ایس ایس سی کامیاب کیا۔ 1978ء میں بی اے صوفیاء کالج ممبئی سے اردو اور فارسی مضامین کے ساتھ فرسٹ کلاس درجہ میں کامیاب کیا۔ بعدازاں ممبئی یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا اور 1985ء میں ہندی سے ایم اے کیا اور یونی ورسٹی رینکر بھی رہیں۔ ایم اے اردو میں فرسٹ کلاس درجہ حاصل کرتے ہی برہانی کالج ممبئی میں سینئر کالج لیکچرر ہوگئیں۔ برہانی کالج میں ملازمت کے دوران انہوں نے جونیئر کالج ٹیچر کا ڈی ایچ ای کورس بھی کرلیا اور ڈاکٹر آدم شیخ کی نگرانی میں اردو انشائیہ پر پی ایچ ڈی میں داخلہ بھی لے لیا۔ بعدازاں کھپولی کے (کے ایم سی کالج) میں ملازمت اختیار کرلی اور تاحال شعبہ ہندی میں اسوسی ایٹ پروفیسر وصدر شعبہ ہندی ہیں۔

تخلیقی سرگرمیاں (اردو کے حوالے سے):

(1) صادقہ نواب سحر کا پہلا شعری مجموعہ ''انگاروں کے پھول'' 1996ء میں منظرعام پرآیا۔

(2) ''پھول سے پیارے جگنو'' (بچوں کی نظموں کا مجموعہ) 2003ء

(3) ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' (ناول) 2008ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی

(4) مکھوٹوں کے درمیان (اردو کا طبعزاد ڈرامائی مجموعہ) 2012ء تخلیق کار پبلشر، دلی

(5) خلش بے نام سی (افسانوں کا مجموعہ) 2013 ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی

(6) ''جس دن سے......(ناول) 2016 ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی

(7) پیچ ندی کا مچھیرا (افسانوی مجموعہ) 2018، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی

صادقہ نواب سحر بیک وقت شاعرہ، ایک افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نگار، تنقید نگار اور مترجم کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتی ہیں ۔ اردو، ہندی، انگریزی اور مراٹھی چاروں زبانوں سے بخوبی واقفیت بھی رکھتی ہیں اور اپنی تخلیقات کو منظرعام پر لاتی ہیں۔ ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین افسانہ، نظمیں، غزلیں وغیرہ مختلف رسائل شاعر، سب رس، آج کل، ایوان اردو، نیا دور، انشاء، بزم سحرا، تکمیل، اسباق، تحریرنو، بیباک، جدید ادب، قومی زبان، اردو دنیا، عالمی سہارا کے علاوہ انگریزی اور مراٹھی کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ہم عصر ادبی منظرنامے اور بالخصوص خواتین قلمکاروں میں صادقہ نواب سحر ایک اہم نام ہے اور کئی اعتبار سے انہیں ہمعصروں پر امتیاز بھی حاصل ہے۔ دراصل وہ ہمارے عہد کی ایک ایسی فکشن نگار ہیں جنہوں نے بہت ہی کم وقت میں نہ صرف اپنی ایک علیحدہ شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے بلکہ بہت کم عرصہ میں ان کی کئی ایک تخلیقات ایک کے بعد ایک منظرعام پر آتی گئیں اور ادبی دنیا میں کامیابی کا سہرا انہوں نے اپنے سر لے لیا۔ یقیناً ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کو جو شہرت حاصل ہوئی۔ ایسی شہرت بہت کم ناولوں کو حاصل ہوئی۔ جب ہم ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں جو تخلیقی اظہار ہے وہ موجودہ عہد کے مسائل پر مبنی ہیں اور خصوصاً خواتین کے مسائل، سماج میں درپیش حالات وغیرہ کو انہوں نے اپنے کرداروں کے ذریعہ منظرعام پر لایا ہے۔ ان کے کردار خواتین کو سماج کے حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت بخشتی نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ایک عورت قلمکار ہونے کی وجہ سے خود اپنے شعر کے ذریعہ وہ خواتین کو ہمت اور حوصلہ بھی دیتی ہیں۔

میں عورت ہوں فطرت میں ہے میری
میں اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں

ادبی سرگرمیاں:

صادقہ نواب سحر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''انگاروں کے پھول'' 1996ء میں منظر عام پر آیا۔جس میں انہوں نے سماجی ومعاشی مسائل کو پیش کیا ہے اور نسوانی جذبات واحساسات کی بھی ترجمانی کی ہے۔اُن کا دوسرا شعری مجموعہ '' پھول سے پیارے جگنو'' بچوں کی نظموں پر مشتمل ہے جو 2003ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں انہوں نے بچوں کیلئے خوبصوت نظمیں لکھی ہیں جن میں سے ایک ''آؤ دعا مانگیں''،نظم بے حد مقبول ہوئی۔اور یہ نظم مہاراشٹرا کے بال بھارتی کی پانچویں جماعت کے نصاب میں شامل ہے۔ بقول صادقہ نواب سحر وہ بچپن میں شاعری بڑے شوق سے پڑھتی تھیں جن پر اُن کی والدہ بہت ہنستی اور خوش ہوئی تھیں۔صادقہ نواب سحر اپنی بارے میں لکھتی ہیں:

> ''اُن دنوں شاعری میرے اظہار کا ذریعہ زیادہ تھی کہ وہ تو ذہن میں تیار ہونے کے بعد کچھ ہی منٹوں میں کاغذ پر اتر جاتی تھی لیکن شاعری کو چھپنے کے لیے کم بھیجا۔اب بھی کم ہی بجھواتی ہوں کئی اہم مشاعروں میں بھی شریک ہوئی۔خوش قسمتی سے ایک شعری مجموعہ بھی آ گیا۔ یہ میری پہلی کتاب تھی۔اس کتاب کو میں کہیں پہنچ نہیں پائی ۔کیا پتہ تھا کہ پہنچانا بھی ہوتا ہے !ناشر،قتیل راجستھانی صاحب نے مجھ سے کہا بھی کہ میں اسے غزل گائیکوں تک پہنچاؤں اور شاعری کی

طرف رخ ہوا۔غزل سے زیادہ زندگی کی تلخ اور شیریں
سچائیوں کو آزاد اور نثری نظموں میں اتارنے لگی۔خلوصِ دل
سے دنیا کو شاعری میں سمیٹا' تکمیل نے ممبئی کے شعراء پر نمبر
نکالا مجھے بھی شامل کیا جنیوئن شاعر مانی جانے لگی'' 3

صادقہ نواب سحر کی 10 نظمیں جو ''دلت طبقہ'' کے حالات پر مبنی ہیں۔ ایسے جرمنی سے شائع ہونے والے رسالے'' جدید ادب'' نے خصوصی طور پر شائع کیا۔ مہاراشٹرا' پونا اردو ساہتیہ پریشد سے ''پروین شاکر'' ایوارڈ سے نوازا گیا اور صادقہ نواب سحر باقاعدہ طور پر ادبی دنیا میں ایک شاعرہ کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہی۔

صادقہ نواب سحر نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اگرچہ شاعری سے کہا اور اس میدان میں انہیں بڑی حد تک کامیابی بھی ملی۔لیکن ابتدا ہی سے اُن کے مزاج میں شاعری کے ساتھ ساتھ فکشن سے لگاؤ بھی پروان چڑھتا رہا۔

صادقہ نواب کہانیوں سے دلچسپی اور لگاؤ کے بارے میں لکھتی ہیں:

'' یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں اسکول کی لائبریری کی
چھوٹی چھوٹی رنگین کرسیو ں پر بیٹھ کر بچوں کی کہانیوں'
ڈراموں اور نظموں کی کتابیں لائبریری پریڈ میں پڑھا کرتی
تھی اور شاعری کی دنیا میں غرق رہتی !بعد میں کتابوں میں
چھپا کر کہانیاں اور ناول پڑھنے کے شوق نے جکڑے رکھا'' 4

صادقہ نواب سحر کی توجہ ابتداء ہی سے فکشن کی طرف بڑھنے اور جوں جوں اُن کا

ذوق پروان چڑھتا گیا اُن کی توجہ بھی فکشن کی طرف زیادہ مائل ہونے لگی ۔کئی ایک رسالوں میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے۔وہ ایک شاعرہ اورافسانہ نگار کہلانے لگی۔

اب تک کہ ان کے ادبی سفر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر میر تراب علی لکھتے ہیں:

''مہاراشٹرا کے ادبی' تہذیبی اور معاشرتی جمالیات کو جن فنکاروں نے اپنی تخلیقی نور سے منور کیا ہے ان میں ایک باوقار اورمحترم نام ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا ہے۔ڈاکٹر صادقہ نواب سحر بیک وقت ایک تخلیق کار' ڈراما نگار' ناقد' محقق' شاعرہ اور مترجم ہیں جو اپنے تخلیقی اظہار کے کینوس پر فکر ونظر کے نئے رنگ بکھیرتی جارہی ہیں ۔ان کی تمام تخلیقات علم وآگہی' فہم وادراک' محسوسات اور تفکرات کی آئینہ دار ہیں۔''5

2008ء میں انہوں نے اپنا شاہکار ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' لکھا۔اور آج علمی وادبی دنیا میں ایک اہم فکشن نگار کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتی ہیں۔صادقہ نواب سحر کی ناول نگاری کے بارے میں پروفیسر بیگ احساس لکھتے ہیں:

''صادقہ نواب سحر اُن فنکاروں میں سے ہیں جو طرزتحریر کی وجہ سے منفرد پہچان بناتے ہیں ۔ وہ اپنے طرز کے خود ہی موجود ہیں ۔اُن کی زبان اور لفظیات نے اردو ادب میں ایک نئے رنگ کا اضافہ کیا۔ اردو فکشن میں کوئی ایسا کردار ایک طویل عرصے سے تخلیق نہیں ہوا جسے یادرکھا جائے ۔متاشا

نے اس کمی کو پورا کیا ہے۔6

بلا شبہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صادقہ نواب سحر نے ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' لکھ کر ایک خاتون ناول نگار ہونے کا فرض ادا کیا ہے کیوں کہ نسائی مسائل اور سماج میں ہورہے خواتین پر ظلم و جبر کا احساس ایک خاتون قلمکار ہی اپنے نسائی درد وکرب کے ساتھ اپنی تخلیقات میں بیان کرسکتی ہیں۔سلام بن رزاق لکھتے ہیں:

> ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' صادقہ کا پہلا ناول ہے۔سماج میں عوت کے استحصال کی داستان بڑی دل سوز ہے مگر جب کوئی عورت اس تھیم کو بیان کرتی ہے تو اس کی شخصیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' میں صادقہ نواب سحر عورت کے کرب و بے بسی کو اس پر اثر انداز میں بیان کیا ہے کہ مظلومی نسواں کی ایک تصویر آنکھوں میں گھوم جاتی ہے''۔7

صادقہ نواب سحر نے ناول کا مرکزی کردار ''متاشا'' کو تمام ناول میں کہیں بھی خوشیاں مناتے' خوشگوار ماحول کا لطف لیتے نہیں بتایا۔محض صرف اس لیے کہ وہ ابتداء ہی بتا چکی ہیں کہ ''متاشا'' کی پیدائش سے کوئی خوش نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس کی ماں خود بھی وجہ صرف یہاں ایک ماں کی ممتا کا وہ باطن بیان کیا گیا ہے۔

وہ خود ایک عورت ہے اور زمانے کے ظلم وستم سہتے سہتے بے بس ہی نہیں بلکہ بے حس بھی نظر آتی ہیں جس کو خود اپنی بیٹی پر بھی پیار نہیں آتا۔یہ غور طلب بات ہے۔

موجودہ عہد کی ایک اہم اور نامور قلم کار نگار عظیم کردار متاشا کے بارے میں لکھتی ہیں:

''عورت کی تمام زندگی (خواہ وہ جاہل ہو یا پڑھی لکھی)
جدوجہد کا دوسرا نام ہے کوئی اس سے مقابلہ کرکے آگے نکل
جاتا ہے کوئی اس کی بھینٹ چڑھ کر ختم ہو جاتا ہے۔آپ کے
ناول کا مضمون بھی یہی ہے جسے آپ نے بڑی حد تک
چابکدستی سے متاشا کے ذریعہ بیان کیا ہے۔''8

اس ناول کو پڑھنے کے بعد مجموعی اعتبار سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی عورتوں کے مسائل ماضی ہی کی طرح ہے اور صادقہ نواب سحر نے خواتین کو درپیش مسائل اوران کے احساسات وجذبات کی بھرپور نمائندگی کرتی نہ صرف آتی ہیں بلکہ خواتین کو حالات سے مقابلہ کرنے کی تلقین بھی دیتی ہیں۔

انعامات واعزازات:

(۱) مہاراشٹرا ساہتیہ اکادمی کا سنہ ۲۰۰۴ کے لیے ''ساحرلدھیانوی ایوارڈ''

(۲) مہاراشٹراار دوساہتیہ اکادمی کا مکھوٹوں کے درمیان (اردو کا طبعزاد ڈرامائی مجموعہ)

(۳) بہار اردوساہتیہ اکادمی کا ''رشیدت النساء ایوارڈ'' کہانی کوئی سناؤ متاشا' پر

(۴) بہار اردوساہتیہ اکادمی کا ''شکیلہ اختر ایوارڈ'' افسانوی مجموعہ 'خلش بے نام سی' پر

(۵) اتر پردیش اردوساہتیہ اکادمی کا کل ہند ایوارڈ' ناول' کہانی کوئی سناؤ متاشا' ر

(۶) اتر پردیش اردوساہتیہ اکادمی کا کل ہند ایوارڈ' افسانوی مجموعہ 'خلش بے نام سی' پر

(۷) مہاراشٹرا ہندی ساہتیہ اکادمی کا 'منشی پریم چند ایوارڈ' منّت افسانوی مجموعہ پر

(۸) مہاراشٹرا ہندی ساہتیہ اکادمی کا جینیندر کمار ایوارڈ، ناول' کہانی کوئی سناؤ متاشا' پر

(۹) بھارتیہ بھاشا پریشد' کولکتا کا یُو الیکھک پرکاش سمّان' ناول' کہانی کوئی سناؤ متاشا' پر

(۱۰) مغربی بنگال اردو ساہتیہ اکادمی کا '' مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ'' افسانوی مجموعہ'

خلش بے نام سی' پر

(۱۱) مہاراشٹرا اردو ساہتیہ اکادمی کا فکشن ایوارڈ' جس دن سے......!' ناول پر

(۱۲) بہار اردو ساہتیہ اکادمی کا فکشن ایوارڈ' جس دن سے......ناول پر

(۱۳) مہاراشٹرا اردو ساہتیہ اکادمی سے' میر تیج بیورو' نامی یکبابی ڈرامے کو' بیسٹ

اسکرپٹ رائٹنگ کا انعام۔

(۱۴) اردو ساہتیہ پریشد' پونا سے پروین شاکر ایوارڈ

(۱۵) اسباق میگزین ایوارڈ' پونا

(۱۶) مجروحؔ اکادمی ایوارڈ

(۱۷) آدرش شکشک پُرسکار

(۱۸) شری بالوجا ساہتیہ کلا اکادمی ایوارڈ' دہلی

(۱۹) مہاراشٹرا لوک کلیا نکاری سیوا سنستھا نے' مہاراشٹر گورو پرسکار

(۲۰) مراٹھا سیوا سنگھ نے' جیجاؤ ساوتری سمان'

(۲۱) یواجگت اخبار کا اعزاز

(۲۲) ہندی بھوشن' (راشٹریہ ہندی ساہتیہ پریشد' میرٹھ' اتر پردیش)

(۲۳) ساوتری بائی پھلے ویرا انگنا نیشنل فیلوشپ ایوارڈ' ۔ (بھارتیہ دلت ساہتیہ اکادمی' دہلی)

(۲۴) ہماکشر انیشنل ایوارڈ ۲۰۱۰

(۲۵) ساہتیہ اکادمی کے کئی پروگراموں (ممبئ' اودے پورے اور پورٹ بلیئر) میں اپنی کہانیاں' غزلیں و نظمیں پیش کیں۔

(۲۶) بے شمار مشاعروں' ٹی وی ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں حصہ لیا۔

بیرونی ممالک ادبی پروگراموں میں شرکت:

ا۔ ماریشس' ۲۔ دوبئ' ۳۔ جدّہ' ۴۔ لندن' ۵۔ پیرس' ٦۔ سوئزرلینڈ

صاقہ نواب سحر کی شخصیت :

شخصیت انسان کی ظاہری و باطنی خصوصیات کا مجموعہ ہوتی ہے جس میں انسان کی سیرت و کردار' عادات و اطوار' چال ڈھال' پہنوا' اخلاق و احساس وغیرہ شامل ہیں۔

صادقہ نواب سحر کی شخصیت میں بھی ظاہر و باطنی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اپنے اطراف و اکناف کا ماحول بڑی حد تک اثر انداز ہے۔ ان کی شخصیت بڑی ہمہ جہت ہے اور اپنے قارئین کو اپنی جانب مکمل طور سے متوجہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر

خوش مزاج، خوش اخلاق خاتون ہیں۔ مزاج میں بناوٹ بالکل بھی نہیں ہے۔ سیدھی سادھی شخصیت کی حامل ہیں۔ ہمہ وقت ان کے چہرے ایک تبسم کھلتا رہتا ہے۔ اُن کا تبسم سے لبریز چہرہ چمکتی آنکھیں شفاف ذہن کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہی اوصاف ہے جواُن کی تحریروں میں بھی نظر آتے ہیں۔

اوصاف انکساری اتنی ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہم کسی بڑی قلمکار سے بالمشافہ ملاقات کرر ہے ہوں سادگی کا مکمل پیکر ہے۔

صادقہ نواب سحر کی شخصیت کے بارے میں پروفیسر سید تراب علی ید اللہی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کی شخصیت بڑی زندہ دل، رنگارنگ، ہمہ جہت، مرتب اور متوازن ہے ان کے تصور سے ان کا مسکراتا چہرہ، روشن جبین، نورِ علم سے چمکتی آنکھیں اور بوئے اردو سے مہکتا ہوا لہجہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

وسیم بریلوی کے الفاظ میں:

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے
ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے 9

صاقہ نواب سحر ایک بہترین فنکارا ہونے کے ساتھ ساتھ انسانوں کی قدرداں بھی ہیں۔ انسانی جذبات کو سمجھنے والی، دلوں کو پرکھنے والی اور زندگی کی گہرائیوں کا پیمانہ کو سلیقہ مندی کے ساتھ جانچنے والی خاتون ہیں۔ انسانی نفسیات کو بخوبی سمجھنے کا ہنر جانتی ہیں۔ رشتوں کو خوب نبھاتی ہیں۔ خوشگوار زندگی گذارنا اور نبھانا اُن کا مقصد

حیات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تخلیقات میں عصر حاضر کے حالات و واقعات پر وہ سوالات اٹھاتی نظر آتی ہیں۔

نذیر فتح پوری صادقہ نواب سحر کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ممبئی اور پونے ہائی وے پر پہاڑوں کے درمیان گھری ایک قدیم بستی ہے جس کا نام کھپولی ہے۔روشن اور جگ مگ کرتی ہوئی یہ بستی روشنی کا جزیرہ معلوم ہوتی ہے۔
یہاں سے گذرتے وقت میرے ذہن میں اجالوں کے بے شمار جنگی لہرانے لگتے ہیں اور میرے تصور کو مقناطیسیت اس وادی میں ایک ایسی شخصیت کو تلاش کرنے لگتی ہے جس کا حکم ان دنوں اجالوں کا حاتم بن کر تخلیقی جنگجوؤں کی سوغات چاروں طرف تقسیم کررہا ہے ۔اس روشن بستی کی واحد تخلیقیت پرور شخصیت کا نام ڈاکٹر صادقہ نواب سحر ہے''[10]

صادقہ نواب سحر کی شخصیت کے بارے میں ثروت خان لکھتی ہیں:

''مسکراتے شوہر کے ہمراہ خود بھی مسکراتی، ہشاش بشاش نظر آتی ہیں ۔میری دوست ہیں۔ اس لیے جانتی ہوں کہ بچوں کے لیے کتنی فکرمند اور مستعد رہتی ہیں۔
رشتے نبھانا وہ جانتی ہیں ایک دوست ہونے کے ناطے میں نے ان میں ہمیشہ خلوص اور ہمدردی کی جھلک پائی ہے۔کسی بھی ادبی گفتگو کے دوران بحث ومباحثہ میں الجھتے کبھی نہیں دیکھا انہیں کبھی بھی احتجاج کرتے، مشتعل ہوتے نہیں دیکھا

نہ مہذب، بغاوت دیکھی، نہ خاموش آگ محسوس کی'' 11؎

صادقہ نواب سحر کی شخصیت باغ و بہار شخصیت ہے۔ اُن کی گفتگو میں نرمی ہوتی ہے۔ لہجہ اطمینان بخش گویا اور باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اُن سے جو بھی ملا وہ محسوس کرسکتا ہے کہ وہ خلوص اور ہمدردی کا پیکر ہے۔ پیٹ پیچھے برائی سے وہ سخت پرہیز کرتی ہیں اور دوسروں کو بھی روکتی ہیں ۔صادقہ نواب سحر خوش مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ و شائستہ طبعیت کی مالک ہیں۔ پڑھنے لکھنے اور کچھ کرگذرنے میں مصروف رہنا چاہتی ہیں ۔جب بھی انہیں کسی ادبی محفل میں اظہار خیال کا موقع ملتا ہے بڑے ہی اطمینان کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔

حلیہ: صادقہ نواب سحر کواللہ رب العزت نے سلیقے وطریقے سے تراشا ہے۔رنگ روپ بھی بڑا دلکش ہے۔چمکتی آنکھیں، چہرہ پرکشش ہے۔گالوں پر گویا گلاب کھلے ہوں۔ان کی سادگی پسند مزاج کی خوبیاں بھی ہیں جوانہیں ہمیشہ خوش وخرم بنائے رکھتی ہیں۔

بحیثیت ماں: صادقہ نواب سحر اپنے دونوں بچوں ایک بیٹی اور ایک بیٹا دونوں کی بہت اچھی طرح پرورش کی تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا دونوں الحمداللہ شادی شدہ ہیں اور صاحب اولاد بھی ہیں یعنی صادقہ نواب سحر اللہ کے فضل وکرم سے نانی اور دادی جیسے قابل احترام مقدس رشتہ کو بھی حاصل کرلیا ہے۔

صادقہ نواب سحر کے شوہر صادقہ نواب سحر کی سلیقہ مندی اور سمجھ داری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سمجھدار سلیقے مند اور اپنی عمر سے زیادہ Matured ہے۔

لکھنے کے مرحلوں میں صادقہ نے کبھی گھر کو نظر انداز نہیں
کیا''۔12؎

صادقہ نواب سحر کفایت شعار اور گھریلو ذمہ داریوں کو سلیقے سے نبھانے والی خاتون ہیں۔اس بارے میں اُن کے شوہر اسلم نواب صاحب لکھتے ہیں:

''اُن دنوں ہمارے گھر میں پیسوں کی پریشانی تھی۔بزنس ٹھیک سے نہیں چل رہا تھا۔ایسے وقت میں بھی صادقہ نے بہت ساتھ دیا دوسری خواتین کی طرح بے جا شکایتں' خواہشیں نہیں کرتیں'' 13؎

مہمان نوازی: صادقہ نواب سحر نے جس ماحول میں اپنی پرورش پائی وہ ابتداء ہی سے علم وادب کا مرکز اور تہذیب وتمدن کا گہوارا رہا ہے۔صادقہ نواب سحر لکھتی ہیں:

''گھر میں ایک قصص الانبیاء تھی۔ہر رات کھانے کے بعد ہم سب ہال میں اکھٹا ہوتے تھے۔میں اسے پڑھتی اور نانی اس کا خلاصہ کرتی جاتیں۔کبھی کبھی وہ خود بھی پڑھ کر سناتیں۔آہ نانی! انہوں نے ہی تو ماں کی روایت دی تھی بچوں کے لیے مرمٹ جانے کی۔اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہوئیں اور ساری زندگی شوہر کی ذمہ داریوں اور شوہر کے دیئے ہوئے بچوں کا خیال رکھنے کا وعدہ نبھاتی رہیں''۔14؎

صادقہ نواب سحر کی شخصیت میں جو اطمینان ہے یقیناً اس کا سہرا اُن کے سمجھدار اور قابل احترام شوہر کو جاتا ہے جنہوں نے ہمیشہ اپنی بیوی کا قدم قدم پر نہ صرف ساتھ دیا بلکہ اپنی تخلیق کار اور ساتھ ہی ساتھ پیشہ تدریس کی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے

نبھانے والی بیوی کا ہرلحاظ سے خیال بھی رکھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ اپنی ذمہ داریوں اورمصروفیات کو پرسکون انداز میں حل کرتی ہیں ۔صادقہ نواب سحر اپنے شوہر کے بارے میں لکھتی ہیں:

''میرے شوہراسلم نواب صاحب نے ہرقدم پرنہ صرف میرا
ساتھ دیا بلکہ رہنمائی بھی کی ۔ملک بھرکی سیرکروائی ۔ہم نے
بیرون ممالک کے تجربے بھی حاصل کیے''۔15ے

اب کچھ اسلم نواب صاحب کی جانب سے صادقہ نواب سحر کی تعریف دیکھیئے :

''جاب کے ساتھ تخلیقی کام کرتے ہوئے انہوں نے گھرکواچھا
سنبھالا ۔بچوں کوہی نہیں اُن کے بچوں کا دوسرے گھر والوں
کا بھی خیال کیا۔وہ ایک اچھی بیوی ہیں ۔بہت محبت کرتی ہیں
۔وہ ایک کامیاب بیوی' کامیاب ماں ہی نہیں بلکہ کامیاب
رائٹراورکامیاب پروفیسر بھی ہیں''۔16ے

دونوں کا خلوص ومحبت ایک دوسرے پرجان نچھاور کرنے کے اندازمحبت کودیکھ کرگمان ہی نہیں بلکہ یقین ہوجاتا ہے کہ اللہ رب العزت نے بڑی فرصت اوراطمینان کے ساتھ یہ میاں بیوی کی جوڑی بنائی۔تب ہی تو صادقہ نواب کہتی ہیں کہ:

'' اسلم نواب کے قدموں
میں تو میراخواب ہے
اورتوہی میری حقیقت ''

(شعری مجموعہ انگاروں کے پھول)

حوالے

1۔(بیچ ندی کا مچھیرا(افسانوی مجموعہ)'از:صادقہ نواب سحر'ص:10)

2۔(بیچ ندی کا مچھیرا''سُنئے تو سہی!''ص:9)

3۔(بیچ ندی کا مچھیرا'ص:12)

4۔(بیچ ندی کا مچھیرا'سنئے تو سہی'ص:9)

5۔(ماہنامہ شاعر'ص:28)

6۔(صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن'فکشن کے تناظر میں'ص:145)

7۔(صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن'فکشن کے تناظر میں'ص:145)

8۔(صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن'فکشن کے تناظر میں'ص:406)

9۔(صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن'فکشن کے تناظر میں'ص:44)

10۔صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن'فکشن کے تناظر میں'

11۔(صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن'فکشن کے تناظر میں'ص:41)

12۔(صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن'فکشن کے تناظر میں'ص:145)

13۔(صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن'فکشن کے تناظر میں'ص:13)

14۔(بیچ ندی کا مچھیرا(افسانوی مجموعہ)'از:صادقہ نواب سحر'ص:10)

15۔(بیچ ندی کا مچھیرا(افسانوی مجموعہ)'از:صادقہ نواب سحر'ص:12)

16۔(صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن'فکشن کے تناظر میں'ص:30)

باب دوم

ناول کی تعریف اور خواتین ناول نگار:

ناول انگریزی لفظ' اطالوی لفظ Novella سے مشتق ہے۔ Novel کے معنی ہیں نیا' انوکھا' جدید۔ ناول بہ حیثیت ایک صنف کے نسبتاً ایک نئی صنف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ناول کے بعض اجزاء داستانوں میں بھی ملتے ہیں۔

دراصل ناول ادب کی وہ صنف ہے جس میں انسان کے انفرادی اور اجتماعی تجربے کے اظہار کی صلاحیت ہے۔ تخلیق کار صرف ایک ناول نگار ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے ملک اور اپنے معاشرہ کا ایک رکن بھی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ وہاں کے تمام معاملات' مسائل کے بارے میں اس کی جو ذاتی رائے اور خیالات' جذبات واحساسات ہوتے ہیں اس کا عکس اس کی تحریر میں کسی نہ کسی طرح ظاہر کرتا ہے۔

ناول لفظوں کا فن ہے۔ ناول لکھنے والا ناول کے کرداروں کو زندگیوں کے ذریعہ کچھ اس طور پر پیش کرتا ہے کہ وہ بڑی حد تک حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ ناول نگار ایک خاص فنی اصول اور تکنیک کے تحت انہیں ایک ایسی وضع بخشتا ہے جو تسلسل کے ساتھ سلسلہ وار اپنی طرف مائل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

ناول میں زندگی کو ایک خاص فنکارانہ طریقے سے پیش کیا جاتا ہے اس لیے وہ کئی اعتبار سے اپنے قاری کو پڑھنے کے لیے اکساتا ہے۔

ناول ہمیں یہی تاثر فراہم کرتا ہے کہ اپنے غموں اپنی خوشیوں' اپنے اتفاقات اور

اپنے جذبوں میں ہم تنہا نہیں ہیں۔اس معنی میں ناول ایک دوسرے طریقے سے ہمیں اپنے وجود کا بھرپور احساس دلاتا ہے اور دوسرے انسانوں کے احساسات میں شمولیت کی راہ فراہم کرتا ہے۔

ناول نگار محض ایک کے بعد ایک واقعات پیش نہیں کرتا بلکہ اکثر ان واقعات کے پیچھے رونما ہونے اورکرداروں کی زندگیوں پر وہ کس طور پر اثر انداز ہوئے ہیں انہیں بیان بھی کرتا ہے۔

ناول جن کرداروں کو ان کی مختلف خصوصیات کے ساتھ پیش کرتا ہے' ہمیں اکثر اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس قسم کے کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے۔بعض کردار نسبتاً پیچیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ان کے اندر زندگی کی قوت کا احساس ہوتا ہے جو انہیں ہمہ وقت سرگرم رکھتی ہے۔اس قسم کا کردار ایک خاص ماحول کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے اوراپنے اطراف ایک ماحول بھی پیدا کرتا ہے۔وہ اپنے انسان ہونے یعنی ایک ایسی زندہ ہستی کا تاثر فراہم کرتا ہے جو متاثر بھی کرتا ہے اور دوسروں پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ایسا ہی ایک اہم کردار اکیسویں صدی میں تخلیق ہوا جسے صادقہ نواب سحر نے اپنے ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کے ذریعہ کیا۔عصمت چغتائی سے قبل خواتین قلمکاروں نے جو کچھ لکھا وہ خواتین کی اخلاقی سطح کو بلند کرنے اوران کی اصلاح کرنے کے لیے لکھا۔عصمت کی نظر معاشرہ کی اصلاح پر تھی۔

پریم چند کے بعد اردو ناول کو نئی جہت' نئی سمت' نئی فکر اور حقیقت بیانی پر مبنی نئے موضوعات عطا کرنے والی خواتین ناول نگاروں میں عصمت چغتائی کا نام سرفہرست

ہے۔عصمت چغتائی 21 اگست 1915ء کو بدایوں میں پیدا ہوئیں اور 24 اکتوبر 1991ء کو ممبئی میں اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ناول ''ضدی'' 1940ء کے ساتھ عصمت چغتائی نے ناول نگاری کی ابتداء کی بعد میں انہوں نے کئی ناول لکھے۔عصمت چغتائی پہلی نسائی حسیت پسند ناول نگار ہیں۔جو عورتوں اور لڑکیوں کے کردار کا نفسیاتی جائزہ لینے اور ان کے فطری جذبوں کو جوں کا توں ڈھال دینے کی مہارت رکھتی تھی۔عصمت چغتائی کی بے باکی اور نسائی حسیت کے بارے میں حمیرہ سعید لکھتی ہیں۔

''نسائی حسیت کے اعتبار سے عصمت کا نام بے حد اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ انہوں نے اپنے معاصر خواتین ناول نگاروں کی طرح مردانہ سماج کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوں یا مرد ناول نگاروں سے متاثر ہو ناول نہیں لکھے بلکہ انہوں نے جس سماج کو دیکھا، جس طرح محسوس کیا عورت کی حالت کو جس طرح پایا ویسا ہی بیان کر دیا اور عورتوں کے مسائل و زندگی کو اتنی باریکی و نزدیکی سے بیان کیا جو کہ ایک عورت ہی کر سکتی ہے۔ان کے طرز تحریر یں خالص نسوائی انداز ملتا ہے اور اُن کی پیشکشی کا انداز ان کی نسائی حسیت کی آئینہ داری کرتا ہے''۔[1]

عصمت چغتائی نے عورت اور عورت سے جڑے مسائل اور معاشرہ کی اصلاح کو اپنے ناولوں کا مرکزی موضوع بنایا۔عصمت چغتائی کے بعد صالحہ عابد حسین ناول نگاری کی دنیا میں اپنی شناخت آپ ہے۔ انہوں نے 1940ء میں ناول ''عذرا'' لکھ کر ناول نگاری کی دنیا میں قدم رکھا۔ ان کا ناول ''آتش خاموش'' 1953ء میں شائع ہوا جو تقسیم ہند سے پہلے کہ سماجی حالات کو بیان کرتا ہے۔اس کے

علاوہ ''راہ عمل'' ناول 1963ء میں شائع ہوا جس میں مصنفہ نے ملک کے بٹوارے کے بعد کے عبرتناک حالات کو بیان کیا ہے۔ ان کے ناولوں کا خاص وصف نسائی حیثیت اور عصری مسائل ہیں۔

خدیجہ مستور خواتین ناول نگاروں میں اپنی ایک اہم شناخت رکھتی ہیں۔ ان کا ناول ''آنگن'' 1962ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا مرکزی موضوع ہندوو پاک کی تقسیم ہے۔ اس ناول کا آغاز دوسری جنگ عظیم سے قبل کے واقعات سے ہوتا ہے اور اختتام ملک کی تقسیم پر ہوتا ہے۔ خدیجہ مستور نے اس ناول میں سیاسی رنگ اور تاریخی رنگ کو بھی ابھارا ہے۔ اس ناول کا اہم کردار عالیہ ہے جو ایک تعلیم یافتہ اور باشعور لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ جس ماحول میں زندگی گذار رہی ہے اس کے تمام نشیب وفراز سے وہ اچھی طرح واقف ہے اور وہ ماحول سے بیزار بھی ہے۔ وہ کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہے لیکن حالات اور معاشرہ اُسے اجازت نہیں دیتے۔

اس ناول کے بارے میں نیلم فرزانہ لکھتی ہیں:

> ''آنگن کی کہانی کا محور ایک بکھرا ہوا زمیندار گھرانا ہے جو اس دور کے بیشتر زمیندار گھرانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ناول دوحصوں میں تقسیم ہے۔ ماضی اور حال، ماضی کا حصہ چند صفحات پر مشتمل ہے ۔فلیش بیک میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ حصہ حال یعنی ناول کی اصل کہانی کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے اسی بنیاد پر پورا ناول آگے بڑھتا ہے اور کہانی کو ایک واضح انجام تک پہنچاتا ہے۔ اس حصہ کو عالیہ (جو ناول کا مرکزی

کردار ہے) کی سوچوں میں ماضی کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔ اس ماضی میں تہمینہ کی موت اور صفدر کے خاندانی پس منظر کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہاں عالیہ کا بچپن اپنے تمام محسوسات کے ساتھ موجود ہے۔ یہی بچپن عالیہ کے موجودہ کردار کی خصوصیات کا منبع ہے۔''2ے

خدیجہ مستور نے ناول آنگن میں اس وقت کی تہذیب اور معاشرہ کے حالات کو بیان کیا ہے جو ناول کے کرداروں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ حالات کو بدلنے کے لیے تہذیب اور سماج سے ہٹ کر کوئی قدم اٹھائے۔ یہی اس ناول کا مقصد ہے۔

جیلانی بانو 14 جولائی 1936ء کو اتر پردیش کے شہر بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ والد حسرت بدایوں ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ جیلانی بانو نے ناول ''ایوان غزل'' 1976ء میں لکھ کر ناول نگاری میں ایک اہم مقام حاصل کیا۔ یہ ناول ایک سماجی ناول ہے جس میں جیلانی بانو نے جاگیردارانہ نظام کی منظر کشی کی ہے اور اس دور کے ہنگامی حالات کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ غزل اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ مجموعی اعتبار سے اس ناول میں انہوں نے کئی ایک اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جہاں ایک عورت کی محبت و وفا شعاری کو بیان کیا ہے وہیں نئے زمانے کے بدلتے حالات اور مرد حضرات کی بے وفائی اور تکبر کو بھی پیش کیا ہے۔ یہ ناول نسائی حسیت پر مبنی ایک عمدہ ناول ہے۔

عصمت چغتائی کے بعد قرۃ العین حیدر نے ناول نگاروں میں اپنا ایک اہم مقام

بنایا اورانہوں نے تاریخی ناول لکھے۔قرۃ العین حیدر ناول نگاری کے فن کو وسیع سے وسیع تر بنادیا۔آگ کا دریا جیسا لازوال ناول لکھ کراردوادب میں اپنے قلم کا پرچم لہرادیا۔قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے''1948ء میں منظر عام پرآیا۔دوسرا ناول ''سفینہ غم دل'' 1951ء میں منظر عام پرآیا۔ یہ ناول اودھ کی معاشرتی تہذیب کی عکاسی پرمبنی ناول ہے۔اس کے بعدان کا شہرآفاق ناول ''آگ کا دریا''منظر عام پرآیا۔جس میں برصغیر کے بٹوارہ کا المیہ بڑے درد وکرب کے ساتھ بیان کیا گیا ہےاوراس ناول کا دوسرااہم پہلوخواتین کاالمیہ ہےجس میں چمپا کوعلامت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔آگ کا دریا کے بعد 1980ء میں لکھا گیا ان کا ناول ''چاندنی بیگم'' بھی خاصی توجہ کا مرکز بنا۔اس ناول میں بھی ملک کی تقسیم کوموضوع بنایا گیا تھا۔

بانوقدسیہ نے افسانے' ڈرامے' خاکے' سوانح اورناول نگاری میں ایک طویل سفر طئے کیا ہے۔انہوں نے ناول نگاری کی ابتداء ناول ''شہر بے مثال'' 1967ء سے کی ۔1981ء میں اپناشاہکارناول ''راجہ گدھ'' لکھااور 2003ء میں ان کا ایک اہم ناول ''حاصل گھاٹ''منظر عام پرآیالیکن جوشہرت ''راجہ گدھ'' کوملی وہ قابل ذکر ہے۔ اس ناول میں پرندوں کی علامت کا استعمال کرتے ہوئے ایک انسان کی ذہنیت کا خاکہ انہوں نے کھینچا ہے۔

ساجدہ زیدی : ساجدہ زیدی کے دوناول منظر عام پرآچکے ہیں۔''موج ہوا پیچاں''اور''مٹی کے حرم''۔ناول مٹی کے حرم تقسیم ہند کے بارے میں لکھا گیا ناول ہے جس میں زوال پذیر معاشرہ کی عکاسی کی گئی ہے۔

زاہدہ زیدی: زاہدہ زیدی کا ایک اہم ناول ''انقلاب کا ایک دن'' 1996ء میں شائع ہوا جو اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول کی کہانی راوی کے ذریعہ آگے بڑھتی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار صادقہ نام کی ایک 22 سالہ لڑکی ہے جو اپنی ذاتی زندگی اور خاندانی پس منظر کا ذکر کرتی ہے۔ یہ ناول دراصل آزادی کے بعد کا ہندوستان اور اس کے حالات کو پیش کرتا ہے۔

اکیسویں صدی کے ناول نگاروں میں خالدہ حسین اہم مقام کی حامل مصنفہ ہیں۔ کاغذی گھاٹ ان کا ایک اہم ناول ہے جو 2002ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں انہوں نے اپنے گہرے مشاہدے کا بھرپور اثر کا اظہار کیا ہے اور قاری ناول کے کرداروں کے ساتھ اس کی سوچ کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ اس ناول میں انہوں نے ہندوستان اور بٹوارے کے بعد کا نیا پاکستان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ خالدہ حسین نے اپنے ناول میں ایک جیتے جاگتے ذہن کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول کی اہمیت موضوع سے کردار سازی میں نظر آتی ہے۔

ترنم ریاض: فکشن کی دنیا کا ایک جانا پہچانا نام جو عصر حاضر کی ایک ایسی خاتون ناول نگار ہیں جن کے دونوں ناول اب تک منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مورتی اور برف آشنا پرندے اور ناول مورتی۔ ناول برف آشنا پرندے کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس ناول میں انہوں نے کشمیر کی پرانی تہذیب کو فکشن کا جامع پہنایا ہے اور ایک اہم سوال یہ اٹھایا ہے کہ وادی کشمیر کی ثقافتی تاریخ پر بھی برف جمی ہوئی ہے، پگھلتی کیوں نہیں یعنی کشمیر کے نوجوان پرندوں کی طرح اِدھر سے اُدھر ہجرت کرنے پر آج بھی مجبور ہیں۔ یہی اس ناول کا مقصد ہے۔ ناول مورتی 2004ء میں

لکھا گیا ایک اہم ناول ہے جو خواتین کے مسائل کے متعلق ہے۔اس ناول کے مطالعہ سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ عہد حاضر میں باوجود اتنی ترقی ہونے کے آج بھی خواتین کے مسائل برقرار ہیں۔

ثروت خان: ثروت خان راجستھان سے تعلق رکھتی ہیں۔انھوں نے اپنا ادبی سفر افسانوں سے کیا اور ناول بھی لکھے۔ ان کے موضوعات عام طور پر راجستھانی عورتوں کے مسائل، زمین کی بولی ٹھولی، وہاں کی سماجی تہذیب، گاؤں دیہات کے دقیانوسی خیالات، عورتوں کی تئیں بڑھتا جانے والا جبر کا رویہ وغیرہ ہیں۔ انہی موضوعات کی بناء پر ثروت خان کی انفرادیت بھی ہے جو ان کو ادبی دنیا میں ایک منفرد شناخت دلاتی ہے۔ان کا ناول ''اندھیرا پگھ'' 2005ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ ایک اہم اور علامتی ناول ہے۔اس ناول میں مصنفہ نے اماوس کی رات کو ایک بیوہ عورت کے تعلق سے کی جانے والی رسم کو مرکز بنا کر لکھا ہے۔ یہ ناول گاؤں، دیہات کی عورتوں کے متعلق رسم ورواج بنانے والے مردوں کی تنگ نظری کا بیان ہے جسے کہانی کی شکل میں ڈھالا گیا ہے۔ دراصل یہ ناول راجستھانی عورت پر ہونے والے ظلم کے خلاف ایک مضبوط آواز ہے۔

نجمہ سہیل: نجمہ سہیل کا ناول اندھیرا ہونے سے پہلے 2010ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں ایک بوڑھے کی زندگی کی کربناک کہانی کو بیان کیا گیا ہے جو محرومیہ رشتوں کی پامالی، اپنوں کے ہاتھوں دیا ہوا غم، اولاد کا دیا ہوا درد، تنہائی کا عذاب اور بہت سی ایسی باتیں جو بوڑھاپے میں یاد آ کر انسان کے اندر ملال پیدا کرتی ہے ان سب باتوں کو مصنفہ نے موضوع بنایا ہے۔ایک بوڑھا شخص جس کا نام آفتاب عالم ہے۔اپنی

بیوی کے انتقال اور بیٹوں کے امریکہ چلے جانے کے بعد اکیلے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے تنہائی کا کرب اور نفسیاتی پیچیدگیاں اس ناول کا اہم کردار ہیں۔ آفتاب عالم اپنی ذہنی کشمکش سے بے پناہ خوفزدہ ہو کر ایک دن اخبار میں اشتہار دیتا ہے:

''میرا نام آفتاب عالم ہے، میں زندہ ہوں، اگر میرے پرانے
دوستوں میں سے کوئی زندہ ہے اور میں اسے یاد ہوں تو مجھ
سے رابطہ حاصل کرے۔''3؎

اس اشتہار سے کئی دوست اس کے رابطہ میں آتے ہیں۔ کچھ پرانے دوست اسی بہانے اس سے ملنے آتے ہیں۔ اکیلے پن کا دکھ پوری کہانی پر حاوی ہے۔ اس طرح نئی صدی کے موضوعات میں ضعیف لوگوں کی زندگی کا معیار معاشرہ کا ایک اہم مسئلہ بن کر ابھر رہا ہے۔ یہی اس ناول کا مقصد ہے۔

شائستہ فاخری : شائستہ فاخری موجودہ عہد کی مشہور و مقبول فکشن نگاروں میں سے ایک اہم نام ہے۔ ان کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے ہے جس کا ماحول نہ صرف ادبی ہے بلکہ خانقاہی بھی ہے۔ ان کی اب تک اردو زبان میں تین افسانوی مجموعہ ''ہر زخم کی پہچان (1992)'' اداس لمحوں کی خود کلامی (2012) اور ''وصف پیغمبری نامہ'' (2016) منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے دو ناول نادیدہ بہاروں کے نشان (2013) اور صدائے عندلیب بر شاخ شب (2014) میں لکھے اس کے علاوہ ایک ناولٹ ''ہری دھوپ پر پیلا پتہ'' کے عنوان سے لکھا اور ایک ریڈیائی ڈرامہ ''حاشیہ پر لکھیں تحریریں'' کے عنوان سے بھی لکھا۔ شائستہ فاخری خانقاہ دائرہ شاہ اجمل سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ دائرہ شاہ اجمل شہر الہ آباد میں واقع ہے۔ اس دائرہ کی

بنیاد حضرت شیخ محمد افضل نے آج سے تقریباً چار سو سال پہلے بادشاہ وقت اورنگ زیب شاہ عالمگیر کے عہد میں ڈالی۔ ناول ''نادیدہ بہاروں کے نشاں' سے ہی انہیں خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ اس ناول میں خواتین کی مظلومیت اور بے بسی کو موضوع بنایا گیا ہے جو مرد کی خودغرضی' انانیت' تکبر اور بے دردی کا نتیجہ ہے۔ 2014ء میں ''صدائے عندلب برشاخ شب'' ناول میں انہوں نے نسائی احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ یہ ناول دراصل نسائی حسیت کا ایک عمدہ ناول ہے جس میں انہوں نے خواتین کی حق تلفی' ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ خواتین کے جذبات واحساسات اور ان کی مرضی ومنشاء کو سمجھنے کی تلقین کی ہے۔ شائستہ فاخری نے اپنے ناولوں کے کرداروں کے ذریعہ خواتین کے درپیش مسائل کے خلاف بیباک انداز میں احتجاج کیا ہے۔

ناول ’’کہانی کوئی سناؤ متاشا‘‘

عصر حاضر کی خواتین ناول نگاروں میں ایک اہم نام ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا بھی ہے جنہوں نے اپنے پہلے ناول ’’کہانی کوئی سناؤ متاشا‘‘ سے ہی ادبی دنیا میں نہ صرف اپنی شناخت قائم کر لی ہے بلکہ ’’کہانی کوئی سناؤ متاشا‘‘ جیسا بہترین ناول لکھ کر ناول کی فہرست میں ایک اچھے ناول کا اضافہ کیا۔

ناول ’’کہانی کوئی سناؤ متاشا‘‘ کا آغاز ’’متاشا کے پردادا کے پردادا سے ہوتا ہے جو جگن ناتھ پوری مندری میں شاستری تھے۔ ان کا مقام پجاری سے اوپر تھا اور نانا کے پرنانا قنوج کے برہمن اور زمیندار تھے۔ اپنے پردادا کے بارے میں متاشا بتاتی ہے:

> ’’پجاری سات دھاگوں کا جنیئو پہنتے مگر ان کا جینو سات سونے کی تاروں کا ہوتا جس کے نیچے موتی اور ہیرے چمک رہے ہوتے۔ انہیں مہاپاتر کا خطاب راجہ کی طرف سے ملا تھا۔ راجہ کے تخت سے اونچے مقام پر وہ بیٹھتے۔ سنا ہے جگن ناتھ پوری کے ایک خاص مندر میں اب بھی ان کا ایک لباس رکھا ہوا ہے۔ وہ گریجویٹ بھی تھے۔ انگریزی بھی خوب جانتے تھے۔‘‘ 4ؕ

شاستری جی خود کانوینٹ میں پڑھے ہوئے تھے‘ اسی لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی

وہیں پڑھایا۔ اسکول میں ہاف پینٹ، شرٹ اور پینٹ پہنتا مگر گھر پر دھوتی اور کرتے ہیں رہتا اور روایتی برہمن لگتا۔ چٹیا بھی صاف نظر آتی۔ میٹرک کے بعد جب یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لے کر بیٹا درگا پرساد گھر لوٹا تو ایک بڑی تبدیلی یہ نظر آئی کہ چٹیا غائب تھی۔ شاستری جی نے اسے گھر سے نکال دیا۔ بیٹے نے اپنے طور پر پڑھائی پوری کی اور ایک لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ حویلی جیسے گھر میں ساری زندگی ماں اپنے بیٹے کے لوٹ آنے کے انتظار میں آخری سانس تک انتظار کرتی رہیں۔

اس ناول میں ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے متاشا جیسے کردار کو لافانی بنا دیا ہے۔ متاشا ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے۔ اقتباس:

> میرے پاپا کو لڑکیوں سے بڑی نفرت تھی لڑکی یعنی بیٹیوں سے میں ان کی پہلونٹی کی اولاد تھی۔ میرے جنم پر وہ تین مہینوں تک دیکھنے بھی نہیں آئے۔ وہی کیا میری پیدائش پر جیسے سبھی نے سوگ ہی منایا۔ پہلی اولاد سبھی کو بیٹا ہی چاہئے۔ 5

متاشا صرف تین مہینے ہی کی تھی کہ اس کے ساتھ سبھی نے نفرت کی سوائے اس کی دادی کے۔ دادا نے جب متاشا کا بھولا خوبصورت چہرہ دیکھا تو وہ اپنے سارے نظریات کو بدل کر متاشا سے پیار کرنے لگی اور سچ تو یہ ہے کہ اس کی زندگی میں تھوڑا بہت پیار اور ہمدردی صرف اسے دادی ہی سے حاصل ہوا۔

پندرہ سال کی عمر میں متاشا کے مزاج میں ضدی پن، غیر سنجیدہ پن اور ہٹ دھرمی آجاتی ہے۔

متاشا اپنی مجبوری کے بارے میں بتاتی ہے کہ اس کا بچپن کیسا گذرا:

> ''اپنے بچپن میں ممی کا صحت مند جسم' تنی ہوئی بھنویں' غصے سے بھری نگاہیں۔ جانے کن کن باتوں سے میں سہم جاتی تھی' چاہے میرا قصور نہ ہو' بھائیوں کی ہی غلطی کیوں نہ ہو' میری ہی پٹائی تو کرتی تھیں۔ پاپا کی موجودگی میں ممی سہمی سی لگتیں۔ پاپا ممی کو دیکھتے ہی گالیاں دینے لگتے۔ یہ مجھے اچھا لگتا مجھے ڈرانے والی پاپا سے جو ڈرتی تھیں جبکہ میں خود بھی پاپا کی مار سے بچتی پھرتی تھی۔''[6]

بچپن سے متاشا کہ ساتھ جو برتاؤ ہوتا آیا ہے اس وجہ سے وہ بہت ہی الجھی سی رہنے لگتی ہے' رشتوں کو لے کر اس کے اندر بے زاری کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اسی سال متاشا کی منگنی یوراج نام کے ایک عیسائی لڑکے سے ہوتی ہے مگر وہ اپنی ہٹ دھرمی اور ضدی پن کی وجہ سے اس رشتے کو برقرار رکھے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ آخر کار منگنی ٹوٹ جاتی ہے۔

جب متاشا کالج جانے لگتی ہے تو باپ اسے اپنے جگری دوست سے ملواتا ہے جس کا نام موریشو ہے جسے وہ کاکا کہتی ہے۔ متاشا کی خوبصورتی پر اس آدمی کی نیت خراب ہو جاتی ہے اور ایک دن موقعہ پا کر وہ جبراً اس کی عصمت ریزی کر دیتا ہے۔ اس باپ کو بیٹی سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا' اس لیے اس نے یہ بات اپنے ماں باپ سے اور باقی سب سے چھپائی کہ کہیں سب اسے ہی غلط نہ سمجھے۔ اس واقعہ کے بعد متاشا مردوں سے شدید نفرت کرنے لگتی ہے۔ مردوں سے نفرت کرنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ اس کا باپ اس کی ماں کے ساتھ ہمیشہ مار پیٹ اور برا سلوک کرتا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے باپ کو اپنی ماں پر ظلم کرتے دیکھتی ہے۔

متاشا کی منگنی ٹوٹنے کے بعد اس کا باپ اس کا رشتہ ایک آدی واسی لڑکا بھرت جیسے ناکارہ آدمی سے کرنا چاہتا ہے تو متاشا کی ماں شیرنی کی طرح بھپرا اٹھتی ہے۔''خبردار! جو ایک قدم بھی آگے آئے تو لکڑی جلا کر آگ میں بھون دوں گی...... میں نے آپ کی ہر بات سہن کی لیکن بھرت سے شادی کر کے اپنی بیٹی کی زندگی اجاڑنے نہیں دوں گی۔متاشا کا چھوٹا بھائی گوپی اس رشتے سے ناراضگی ظاہر کرتا ہے اور ساھت ہی ساتھ ماں بھی پہلی بار اپنی بیٹی کی حمایت کرتی ہے۔اور اس طرح ماں اور باپ میں ہی بہت بدکلامی ار مار پیٹ ہو جاتی ہے۔متاشا اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ اڑیسہ سے کلکتہ آئی جہاں وہ اپنے ماما کے یہاں کچھ دن گزارتی ہے ماما کو جب محسوس ہوتا ہے کہ اس پر اچانک بہت بوجھ پڑ گیا ہے۔تو وہ متاشا کے بھائی کو ماسی کے پاس بھیج دیتا ہے اور اس کے بعد متاشا کی در بدری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔اور وہ کلکتہ‘ علی گڑھ اور بمبئ جیسے شہروں میں رہ کر اپنی ماں اور بھائیوں کے لیے بہتر سے بہتر ضروریات زندگی کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

علی گڑھ میں ایک عیسائی لڑکا سمیر بھی متاشا سے محبت کرتا ہے۔متاشا کی ماں بھی اسے بہت پسند کرتی ہے۔

منگی سے پہلے سمیر کے باپ نے متاشا کو دیکھ کر پسند کیا لیکن مگنی کے وقت سمیر کا باپ اس رشتہ کو ٹھکرا دیتا ہے۔متاشا کی داستان زندگی بڑی عجیب ہے۔متاشا کی زندگی کا مشکل ترین سفر اس وقت تھوڑا آسان ہو جاتا ہے جب اس کی ملاقات گوتم شاہ سے ہوتی ہے۔ جو ایک گجراتی تاجر ہے۔ بہت ہی نیک اور سخی ہے ۔متاشا گوتم سے اپنے بھائی پرساد کی مدد سے ملتی ہے۔گوتم متاشا کی ہر مشکل میں مدد کرتا ہے۔ایک دن

وہ اپنے ماضی کے تمام واقعات سناتا ہے۔متاشا اس کی نیک نیتی اور سادگی سے پہلے ہی متاثر تھی اس کہ حالات سننے کے بعد متاشا کو اس سے ہمدردی ہوتی ہے اور وہ گوتم سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ یہ بات اپنے گھر والوں کو بتاتی ہے۔ پہلے اس کے بھائی بہت ناراض ہوجتے ہیں۔متاشا کو برا بھلا کہتے ہیں' ماں بھی پریشان ہوتی ہے آخرکار بحث وتکرار کے بعد سب راضی ہوجاتے ہیں۔متاشا شادی کے بعد گوتم کے پانچ بچوں کی پرورش کرتی ہے اور اپنی ذمہ داری پوری ایمانداری سے نبھاتی ہے۔ایک دن موریشو رگوتم کے دفتر کو جا کر ماضی کا واقعہ اسے بتا دیتا ہے۔گوتم موریشو کو بے عزت کر کے نکال دیتا ہے۔گھر آ کر متاشا سے اس بارے میں پوچھا ہے اور سچ چھپانے کی وجہ سے ناراض ہوتا ہے۔متاشا بھی پریشان ہوتی ہے کہ گوتم جیسے دیوتا صفت ایک عام آدمی کی طرح سوچتے ہے۔

گوتم سے شادی کے بعد متاشا کو ایک لڑکا ہوتا ہے۔ام پیش ہے۔متاشا ایک اچھی بیوی کے ساتھ ساتھ ایک اچھی ماں کے فرائض بھی انجام دیتی ہے۔گوتم کی پہلی بیوی کا لڑکا انکت ہے جسے ماں کی بے توجہی اور باپ کے بے جا لاڈ و پیار نے حد سے زیادہ بگاڑ دیا ہے۔ جو بہت ہی عیاش اور فضول خرچ کرتا ہے۔انکت دن رات عیاشی میں ڈوبا رہتا ہے۔شراب' جوا کھیلتا اور رات کے وقت سنسان سڑک پر دوستوں کے ساتھ تیز رفتار گاڑی چلانا وغیرہ۔ ایک روز ایک ٹرک ڈرائیور کے ساتھ انکت کی ہاتھا پائی ہوجاتی ہے۔اور وہ گھر میں رکھی تلوار سے اس کا ہاتھ کاٹ دیتا ہے۔معاملے کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے گوتم اس وسرے شہر بھیج دیتا ہے۔

گوتم کی طبعیت اچانک خراب ہوجاتی ہے اور جانچ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے

گردے ناکارہ ہوگئے ہیں۔ ایک غریب اور ضرورت مند گوتم کو گردہ دے کر اس کی جان بچ جاتی ہے۔ گوتم پھر سے اپنے کاروبار میں مصروف ہوجاتا ہے اور کچھ دنوں کے بعد متاشا کی ماں مرجاتی ہے اور متاشا کے بھائیوں کی زندگی میں مشکلوں کا طوفان آجاتا ہے۔ ان تمام حادثات اور مشکلات سے متاشا بہت پریشان رہنے لگتی ہے اسے اپنے بھائیوں کی بہت فکر ہوتی ہے۔

انکت نتاشا پر بری نظر ڈالتا ہے اور اس کی بدنیتی دن بہ دن بڑھتی جاتی ہے۔ متاشا انکت کی اس حرکت کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان رہتی ہے۔ پھر اچانک بخار کی وجہ سے گوتم کی موت ہوجاتی ہے۔ گوتم کی موت کے بعد متاشا کی مشکلیں پھر سے بڑھ جاتی ہے اور وہ بالکل اکیلی ہوجاتی ہے۔ اسے بہت ساری مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

متاشا اپنی پریشانیوں کا حل یادِ الٰہی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مختلف مقامات جیسے اولڈ کھنڈالا کے جیواوٹینس اور کبھی بدھ کے نو وینا میں دعائے مریم میں شامل ہوتی ہے۔ تو کبھی مندر میں پوجا کرتی ہے۔ اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود متاشا کو چین وسکون نہیں ملتا۔

متاشا کے لیے وقت کی گردش پھر سے شروع ہوجاتی ہے۔ شادی سے پہلے جن مشکل حالات سے وہ گزرری تھی ایک بار پھر اسے وہی حالات درپیش آجاتے ہیں۔ پہلے وہ ماں اور بھائیوں کے لیے زندگی سے لڑتی رہی اور اب اپنے اور اپنے بیٹے کے حق کے لیے اسے لڑنا تھا۔

دیپش نونیتا نامی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اسے حاملہ کر دیتا ہے۔ جب اسے پتہ چلتا ہے تو ماں کے ڈر سے بچے کو زائل کرنے کو کہتا ہے۔ نونیتا متاشا کو آ کر سارا قصہ سناتی ہے تو متاشا اسے ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتی بلکہ ممتا کے احساس کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کرتی ہے اور آنے والے بچے کی پرورش کی ذمہ داری خود لینے کا وعدہ بھی کرتی ہے۔

متاشا کے کردار کا تجزیہ کرے تو غیر معمولی صبر و تحمل کے ساتھ وہ ہر مشکل کا سامنا کرتی نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اس کی زندگی میں کانٹے بوتے ہیں لیکن ان کے ساتھ بھی وہ شرافت سے پیش آتی ہے۔ صادقہ نواب سحر نے متاشا کی دکھ بھری داستان بیان کرنے کے لیے جو قصہ متاشا کے ذریعہ بیان کروایا ہے وہ بہت ہی جاندار ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول میں ضمنی کردار بہت زیادہ ہے جنہیں یاد رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ناول میں جس طرح کردار کی بھرمار ہے اسی طرح کئی مقامات کا ذکر ہے۔ منظر نگاری بھی بہت زیادہ ہے۔ اس ناول میں صادقہ نواب سحر نے آخر میں یہ دکھایا ہے کہ ایک لڑکی، ایک بیوی سے ماں اور پھر دادی یا نانی بن جائے پھر بھی خواتین کے ذمہ داریوں اور مسائل کا خاتمہ نہیں ہو پاتا اور وہ کسی نہ کسی طرح مرد حضرات کے ہاتھوں چاہے وہ باپ ہو شوہر یا بیٹا کوئی نہ کوئی ظلم و زیادتی سہنے پر مجبور ہی رہتی ہیں اور یہی مجبوری اور قربانی عورت کی زندگی کا حصہ ہوتی ہے۔ ناول کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس ناول میں انہوں نے ہندو مسلم دونوں طبقے کے کرداروں کی عکاسی کی ہے ۔اس ناول کو مکمل طور پر نسائی حسیت سے بھرپور ناول قرار دینا بھی مناسب نہیں کیوں کہ متاشا وقت اور حالات کا سامنا احتجاج کے ساتھ نہیں بلکہ حالات کی مجبوری سے

کرتی نظر آتی ہے۔ متاشا نئے زمانہ کی عورت ضرور ہے لیکن روایتی رسم ورواج اور سماج کے بنائے ہوئے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے حالات کا سامنا کرتی ہے۔ ناول کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس ناول کے تقریباً مرد کردار مطلبی، موقع پرست اور ظالم ہے۔ مجموعی طور پر موجودہ عہد میں مرد اساس سماج میں متاشا ایک ایسا کردار ہے جس کا استحصال درندہ صفت اس کے باپ کا دوست موریشور کا کا کے ذریعہ ہی نہیں بلکہ ہر اس رشتہ کے ذریعہ ہوتا ہے جس پر وہ اعتماد کرتی ہے۔ متاشا دراصل ایک ایسی علامت کے طور پر سامنے آتی ہے جو موجودہ زمانہ کی عورت کے کردار کی آئینہ داری کرتا ہے۔ یہ ناول موجودہ زمانہ کے عورت کی جدوجہد اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اثرات کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ناول متوسط طبقہ کی خواتین کی نمائندگی ہی نہیں کرتا بلکہ ہندوستانی معاشرہ میں اس کی حیثیت کا تعین بھی کرتا ہے۔

اس ناول کی ایک اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا کینوس زماں اور مکاں کے لحاظ سے بہت وسیع ہے۔ عام طور پر ناولوں میں کسی خاص علاقے میں کسی خاص فرد کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو قلم بند کر کے اس علاقے کی مکمل طور پر عکاسی کر دی جاتی ہے لیکن ان واقعات کے پیش آنے کے بعد مقامات بہت سارے ہیں۔ اڑیسہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے شروع ہونے والی یہ کہانی کلکتہ پہنچ کر پھر علی گڑھ میں اپنے عروج پر پہنچتی ہے۔ اس کے بعد ممبئی، مہاراشٹرا اور گجرات کے کچھ مقامات پر اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ اس طرح اس ناول میں ہمیں کئی مقامات اور ریاستوں کا ذکر مل جاتا ہے۔ معروف افسانہ نگار سلام بن رزاق نے اظہار خیال کرتے ہوئے اس ناول کے موضوع کو بڑی خوبصورتی سے صرف ایک سطر میں بیان کر دیا ہے۔ ''یہ ناول

ایک عورت کے استحصال کی داستان ہے۔

ناول کا آخری باب جس کا نام مصنفہ نے ''سانس سانس سنگھرش'' رکھا ہے بہت اہمیت کا حامل ہے جس کو ہم ایک طرح سے ناول کا نچوڑ قرار دے سکتے ہیں کیوں کہ انسان جب زندگی کے مختلف حالات' مسائل اور مشکلوں سے دوچار ہوتا ہے تو بیحد مایوس ہوجاتا ہے۔ ناول نگار' ناول کے اختتام پر یہ پیغام دینا چاہتی ہے کہ انسان کو مشکلات میں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ زندگی سے راہ فرار اختیار نہیں کرنا چاہئے بلکہ مشکلات میں ہی زندگی کا حل ڈھونڈنا چاہئے۔ اس مقصد کو تلاش کرنا' اپنانا اور زندگی کو پرسکون بنانا ہی فنکار کا مقصد حیات ہے۔ اس بات کا درس اس ناول کا مقصد حیات ہے۔

اس ناول میں دادی کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ناول متاشا کے ساتھ متاشا کی دادی کی ہمدردی سے شروع ہوتا ہے اور جب خود متاشا دادا بنتی ہے تو وہ بھی اپنی بہو کے ساتھ ہمدردانہ رویہ قائم رکھتی ہے۔ دراصل یہاں ناول نگار نے بڑی فنکاری کے ساتھ خواتین کے ساتھ جو مسائل ہے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ متاشا جیسی لڑکیوں کے مسائل کا سلسلہ آج بھی ختم نہیں ہوا بلکہ سماج میں عورت کے ساتھ ظلم و زیادتی آج بھی برقرار ہے۔

مجموعی طور کہا جاسکتا ہے کہ ہمعصر ادب اور ناولوں میں صادقہ نواب سحر کا ناول ایک لاجواب اضافہ ہے۔ خواتین کے مسائل کو صادقہ نواب سحر نے ایک نسوانی کردار کے ذریعہ بڑے درد و کرب کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اردو میں عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے بعد خواتین قلمکاروں میں بہت کم نام ملکی سطح پر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ صادقہ نواب کی کثیر الجہات صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کی ادبی روایت کو آگے بڑھانے والی خواتین قلم کاروں میں ایک نمایاں کردار ادا کریں گی۔

جس دن سے......! ناول :

صادقہ نواب سحر کا یہ دوسرا اہم ناول ہے۔ یہ ناول ایک نفسیاتی ناول ہے۔ جس میں انسانی زندگی کی داستان کو بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار جتیش ہے جسے پیار سے لوگ ''جیتو'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ جیتیش کا تعلق دھن گرجاتی سے ہے جس کے معنی ہیں گھومنے والے بنجارے کے' لیکن اس کے والدین کو آبائی پیشے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ماں باپ دونوں نوکری کئے یہ لوگ اوسط درجے کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیتو سے بڑا ایک اور بھائی نکھل دادا بھی ہے' جیتو چھوٹا چنچل اور شرارتی بچہ ہے جو اپنی زندگی کی داستان اس وقت سے شروع کرتا ہے جب وہ پہلی کلاس میں تھا۔ وہ نٹ کھٹ سا پیارا بچہ تھا' اس لیے بچپن کا دورا سے خوبصورت یادوں کے ساتھ ہمیشہ یاد آتا رہتا ہے۔

بچپن کی یادوں کے سنہرے دور کے آخر میں اسے یہ بھی یاد آتا ہے کہ اس کے ماں باپ میں جھگڑے ہونے لگے تھے۔ جس کی وجہ اس کا باپ اس کی ماں کو بری طرح پیٹتا تھا۔ اس کے منہ میں بیلن ڈال کر دیوار میں سٹا دیتا' اس کی وجہ اس کے والد کی عیاش مزاجی اور دوسری عورتوں میں دلچسپی تھی۔ وہ جیتو کی ماں کے علاوہ دو اور عورتوں سے شادی کرتا ہے لیکن زندگی کسی کے ساتھ نبھا نہیں پاتا۔ جیتو کی ماں شوہر کی ان

حرکات سے بیزار ہوکر علیحدگی اختیار کرلیتی ہے اور کسی اور آدمی سے دوسری شادی کرلیتی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب جیتو ساتویں کلاس میں تھا۔

جیتو چھوٹا تھا باپ کے ساتھ رہ گیا، نکھل ماما کے ساتھ ہوگیا۔ کچھ دنوں میں گھر میں دوسری عورت منیکا کا راج ہوا، جیتو کا ننھا سا ذہن کشمکش میں پڑ گیا، وہ پریشان رہنے لگا، ماں بلاتی میرے ساتھ رہو، باپ کہتا میری سنو، باپ کی دوسری بیوی منیکا کے لیے وہ ہمیشہ بوجھ بنا رہا۔ گھر کے خراب حالات کی وجہ سے وہ نت نئی حرکتیں کرتا، کھانا سے زیادہ چپس تلی ہوئی مرچیاں کھا جاتا، وہ کچھ تو نہیں کرسکتا تھا، خود کو اذیت دیتا رہا۔ اقتباس دیکھیے:

''دراصل مما کو چھوڑ کر جانے کے بعد ڈیڈی کے گھر ڈیڈی کا رویّہ بدل گیا تھا۔ پہلے اور بات تھی۔ یقیناً وہ میرے بارے میں سوچتے تھے۔ انہیں مجھ پر بھروسہ تھا۔ میرے انہیں چھوڑ کر جانے کے بعد زیادہ ٹارچر کرنے لگے۔

''تو اپنی ماں کی طرح ہے!''

''تجھے چودھری چلتا ہے۔ تو اس کے ساتھ رہتا ہے!''

''تو اُدھر جا کر اِدھر کا بولتا ہے!''

''تو مطلبی ہے!''

''دونوں طرف سے ڈھول بجاتا ہے!''

وہ ایسا اس لیے کہتے کہ انہیں اندازہ ہوجاتا تھا کہ میں مما کے پاس گیا تھا۔

''مما کے پاس گیا تھا؟'' آخر وہ پوچھ ہی لیتے۔

''گیا تھا!''

''کیا بول رہی تھی؟''

''چمبور بلا رہی تھیں۔''

''اور جا' ماں ہے نا تیری! یہاں سے نہیں ملے گا تو وہاں سے
ملے گا!''

بھکاری سا محسوس کرتا ہوں۔ لات مار کر دوسری طرف اڑا دو!
شاید میں نشانہ تھا جس کے کندھے پر بندوق رکھ کر وہ ایک
دوسرے پر داغتے تھے!
سمجھتا ہوں ڈیڈ کو مینٹیننس بچانا تھا...... مجھے رکھا !اکیس سال
تک انہیں مینٹے ننس بھرنا نہیں پڑتا !نکھل کا بھتہ تو اس کے
اکیس سال کا ہونے تک دیتے تھے۔
کسی کو میری ضرورت نہیں......''7

جب باپ اسے نہ سنبھال سکا تو اپنے بھائی کے پاس رکھ دیا' رکھنے کے اخراجات بھی دیئے لیکن جیتو کو طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا' وہاں رہ کر اسے رشتوں کی نزاکت کا احساس ہوا' ان حالات میں اس کا رشتوں پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ اس کے اندر ہر ایک سے نفرت کا جذبہ غالب ہونے لگا۔ اسے دنیا کا ہر شخص خودغرض اور مطلبی نظر آنے لگا وہ نفرت کے ساتھ جی رہا تھا۔ سب سے زیادہ اسے اپنی ماں سے شکایت تھی کیوں کہ اس کی ماں نے بھی اس کو اکیلا چھوڑ کر کسی اور آدمی سے شادی رچالی تھی۔ ماں کے تعلق سے وہ سوچتا تھا کہ ماں تو ماں ہوتی ہے۔ وہ تو اپنے بچوں کو پال سکتی تھی' اتنی قربانی تو کرسکتی تھی لیکن اس کی ماں نے اسے الگ کر دیا جس کا اسے ہر پل دکھ

رہا۔ وہ ماں کے بارے میں سوچتا تھا کہ اس کی ممتا بھی خودغرض تھی کہ اس نے اپنے بچوں کو چھوڑ کر دوسرے آدمی چودھری سے رشتہ جوڑ لیا' ننھا جیتو اب ان حالات کی وجہ سے نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہونے لگا۔ اس کا بچپن کھو گیا۔ وہ اس قدر غمگین رہنے لگا تھا کہ وہ سوچتا تھا اور اپنے آپ سے سوال کرتا تھا کہ:

''میں کیا محسوس کرتا ہوں کسی کو نہیں بتا تا مگر جب سوچتا ہوں
کہ مجبور ہوں' اتنا وحشی ہو جاتا ہوں کہ کیا کہوں......کاش جس
طرح دوسری شادی کر سکتے تھے' ویسے دوسرے ماں باپ بھی
چن سکتے۔'' 8

''اس کا بچن اس قدر مشکلات کا شکار تھا کہ اس کا پڑھائی سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ ذہنی اور محنتی ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ پریشان رہتا تھا جس کی وجہ سے ساتویں جماعت میں فیل ہو گیا۔ ان حالات نے جیتو کی زندگی کو عجیب وغریب مسائل سے دوچار کر دیا۔ کبھی کبھی وہ اپنے والدین سے گستاخیاں بھی کرتا اور خود شرمندہ بھی ہو جاتا لیکن اس کے باوجود پتہ نہیں کیسے کیسے اُس نے اپنی عمر کے بیس سال تک اپنے والد کی مار کھاتے ہوئے بسر کیئے۔'' اب اس کے والد نے تیسری شادی بھی کر ڈالی اس لیے اس نے اپنے ڈیڈی سے کہا:

''میرے حصے کی شادی بھی ڈیڈ آپ نے کر لی۔'' 9

وہ ان حالات میں زندگی سے اس قدر بیزار ہو گیا کہ خودکشی کی کوشش کی لیکن پھر بھی اس کے ماں باپ کا سلوک نہیں بدلا' پیسے کے لیے کال سینٹر جوائن کیا' وہ کسی سے اپنا گہرا رشتہ نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ خود کو مریض سمجھنے لگا۔ یہاں تک کہ سائیکالوجسٹ کے

پاس گیا اورسوچا کہ کہیں وہ ابنارمل تو نہیں؟ وہیں اسے ایک ڈاکٹر سائرہ ملتی ہے جس نے جیتو کو بہت سمجھایا۔ پڑھنے لکھنے پر توجہ دینے کو کہا' جیتو جو خود اعتمادی کھو چکا تھا' ڈاکٹر سائرہ کے سمجھانے سے اُسے ہمت افزائی حاصل ہوئی اور وہ اس کے مشوروں کے سہارے اپنے آپ کو مضبوط کرتا گیا۔ دیر سے صحیح اس نے وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور وکیل بن گیا۔اس میں خوداعتمادی آتی گئی۔

صادقہ نواب سحر نے جیتو کے بچپن سے لے کر جوانی تک کی زندگی کا نفسیاتی مطالعہ نہایت آسان طریقے سے پیش کر کے انہوں نے اکیسویں صدی کے بحران زادہ ممبئی کے ماحول کی عکاسی کی ہے اور سماج کے سامنے جیتو کے کردار اور مسائل بیان کر کے حالات پر جو سوالات اٹھائے ہیں اس بارے میں پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں:

''صادقہ کے ناول''جس دن سے......'' میں کال سینٹر' کارپوریٹ ورلڈ' عدلیہ اور تعلیمی اداروں سے وابستہ' نئی نسل کے مردوں اور عورتوں کے حوالے سے جو مکالمے ملتے ہیں وہ ترقی یافتہ شہروں کی طرزِ حیات' طرزِ گفتگو اور لفظیات ومحاوارت کا آئینہ ہیں اور ناول میں ان کا استعمال شعوری طور پر نہیں' بے محابہ فطری انداز میں ہوا ہے قاری کو کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا جیسے ناول نگار نے اپنے ناول میں ان کرداروں کی سوچ اور فکر کی شعور پیوندکاری کی ہے۔ ناول'' جس دن سے ......'' میں تعلیم یافتہ اور روشن خیال نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے اعمال اور اقوال' روایتی اور فرسودہ طرزِ

حیاتت، غیر منطقی مفروضات اور رسومیات سے آزاد بھی ہیں اور تازہ کار بھی۔ معاشی اور معاشرتی حقائق سے قطع نظر، رومانی اور جنسی معاملات، مرد اساس سماج میں طبقہ نسواں کے حقوق اور مطالبات، عصری سیاسی منظرنامہ، تعلیمی پالیسی، سکون قلب کے حصول میں مذہب کا کردار اور پھر آخر کار رشتوں سے نباہ کی ضرورت وغیرہ متعدد نازک اور پیچیدہ معاملات کو صادقہ نواب سحر نے پختہ تخلیقی شعور کے ساتھ موزوں اور متوازن انداز میں برتا ہے اس سے صادقہ کی منفرد تخلیقی ہنرمندی کا اندازہ ہوتا ہے۔10؎

اس ناول کا مرکزی کردار شکست و ناکامیوں سے دوچار ہے جس کو صادقہ نواب سحر نے اپنی آنکھوں دیکھا حال جیسا بیان کیا ہے۔ وہ حالات اور ماحول کا جائزہ بھی لیتی ہیں اور اس پر سوالات بھی قائم کرتی ہیں۔ صادقہ نواب سحر کا ایک اور کمال فن یہ ہے کہ انھوں نے کال سینٹر کی فضا اور موجودہ معاشرہ کے مزاج میں گہری مناسبت ڈھونڈ نکالی ہے۔ بالآخر ناول کا مرکزی کردار جیتو اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اُسے اپنے باپ کے نقش قدم پر نہیں چلنا ہے جس نے اپنے گھر کو بکھیر دیا، اذیت و کرب کا ماحول برپا کر رکھا۔ آخر میں وہ نیچر کو اپنی ماں مانتا ہے۔ اس پورے ناول کو موجودہ عہد کے مشہور و نامور ادیب رتن سنگھ نے چند جملوں میں اس طرح بیان کر دیا ہے جو نہ صرف اس ناول بلکہ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کے فنی اسلوب کی بھی عکاسی کرتا ہے:

''گٹھے ہوئے واقعات، چست جملے، نفسیاتی اعتبار سے حقیقی تجزیہ اور فکری سطح پر مکمل کہانی صرف جیتو کی داستان نہیں رہ

جاتی ہے بلکہ یہ داستان اس ملک کے ان لاکھوں کروڑوں
گھرانوں کی داستان بن جاتی ہے جہاں زندگی اس قسم کے
بدنما حالات کا شکار ہوکر اندھیروں میں بھٹکتی رہ جاتی
ہے۔اس کامیاب کوشش کے لیے صادقہ نواب مبارک باد کی
مستحق ہیں ۔مصنفہ ایک سلجھے ہوئے ذہن کی مالک ہیں اور
کہانی بننے کے فن سے بخوبی واقف۔
ایسے میں امید کی جاتی ہے کہ وہ آئندہ بھی اچھی سے اچھی
تخلیقات سے اردو ادب کو امیر بناتی رہیں گی۔ میری نیک
خواہشات ان کے ساتھ ہیں۔'' 11؎

جب جیتو وکیل بن کر ماں سے ملنے جاتا ہے تو ماں کی ممتا امنڈ پڑتی ہے اور وہ کہتی ہے:

''جیتو رزلٹ کی خوشی میں مدہوش تھا''
صبح کا وقت ہے ۔میں دھیرے دھیرے سے دروازہ کھولتا
کپڑے بدل کر کچن کے پاس جاتا ہوں اور شیر کی آواز نکالتا
ہوں۔مما ڈر جاتی ہیں...... پھر ہنسنے لگتی ہیں۔ میں بھی کتنے دن
بعد ہنسا ہوں۔مما کے ساتھ بہت کم ہنسی مذاق ہوتا ہے۔''
میں نے مما کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ان کی آنکھیں فخر سے
چمک رہی تھیں۔
جانتی تھی وکیل کی ماں بنوں گی ۔میں نے بڑھ کر مما کے
گھنگھریالے بالوں کو چوم لیا اور بہو بھی وکیل لاؤں گی۔ وہ
اپنی بات پوری کر کے رہی۔ 12؎

صادقہ نواب سحر نے فنی لحاظ سے اس ناول میں ممبئی کے آس پاس کے علاقوں میں کس طرح کی الجھنوں بھری زندگی گذارتے ہیں ان رشتوں کے دکھ درد کو بڑی فکر واحساس کے ساتھ بیان کیا ہے ۔اورایک کامیاب ناول لکھنے میں مکمل طور پر کامیاب نظرآتی ہے۔جیتو ایک وکیل بننے کے بعد نہ صرف اپنی ماں کی طرف لوٹ جاتا ہے بلکہ اپنی سوتیلی ماں مینکا اوراسکی سوتیلی بہن کے پڑھائی کی ذمہ داری کا خرچ اٹھانے کا فرض بھی نبھاتا ہے۔ ناول اگرچہ خاندانی جھگڑوں سے شروع ہوتا ہےلیکن اختتام تک صادقہ نواب سحر نے حالات کوخوشیوں میں تبدیل کر کے گھر کے افراد تک آپس میں ایک ہوجانا بتایاہے۔ یہی اس ناول کا اہم مقصد ہے۔اس طرح ناول کا اختتام فکرانگیز انداز میں ہوتا ہےیعنی جیتو کی تمام تر زندگی پراس کے والدین کےلڑائی جھگڑوں کا بے پناہ اثر پڑتا ہے جوموجودہ عہد کے بحرانی حالات کے اثرات کو بڑی تفصیل کے ساتھ دردمندی سے پیش کرتا ہے۔ دراصل ناول جس دن سے حقیقت میں جیتو کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔صادقہ نواب سحر نے ناول کے مرکزی کردار جیتو کو دور حاضر کے نوجوانوں کا نمائندہ بنا کر پیش کیاہے۔اوراس عہد کےنوجوان جن کا خاندان بھکر چکا ہوتا ہےاور وہ جس قسم کے ذہنی وجد باتی اذیت سے دوچار ہوتے ہیں۔اس کی حقیقی داستان کوپیش کیا گیاہے۔اصل میں یہ ناول ایک نہایت حساس مسئلہ کی عکاسی کرتا ہوا ایک موثراورکامیاب ناول ہے۔

حوالے

1۔ (اردوناولوں میں نسائی حسیت‘از: ڈاکٹرحمیرہ سعید‘ص:99)

2۔ (اردوادب کی اہم خواتین ناول نگار‘از: نیلم فرزانہ‘ص:240-241)

3۔ (اندھیراہونے سے پہلے‘از: نجمہ سہیل‘ص:7)

4۔ (’’کہانی کوئی سناؤمتاشا‘‘ص:12)

5۔ (’’کہانی کوئی سناؤمتاشا‘‘ص:17)

6۔ (’’کہانی کوئی سناؤمتاشا‘‘ص:17)

7۔ (’’جس دن سے‘‘ص:78-79)

8۔ (’’جس دن سے‘‘ص:78,79)

9۔ (’’جس دن سے‘‘ص:56)

10۔ (عصری بحران کا آئینہ‘از: پروفیسر قدوس جاوید:ص:56)
(’’صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن: فکشن کے تناظر میں‘‘)

11۔ (’’جس دن سے‘‘ تقریظ: رتن سنگھ‘ص:10)

12۔ (’’جس دن سے‘‘ص:344,45)

باب سوم

صادقہ نواب سحر بحثیت افسانہ نگار :

اردو میں افسانہ کی صنف نثر کی دوسری اصناف کے مقابلہ میں بہت کم عمر ہے۔ تاریخی لحاظ سے دیکھیں تو صنف افسانہ کی شروعات 1903ء میں راشدالخیری کی تخلیق نصیر اور خدیجہ سے ہوئی یعنی نصیر اور خدیجہ ہی اردو کا پہلا طبع زاد افسانہ قرار پایا۔ اس قلیل مدت میں بھی مختصر افسانہ جوش وخروش سے سنجیدہ قارئین کے ساتھ ساتھ عام پڑھے لکھے قاری میں بھی مقبولیت حاصل کرتا گیا۔ اس عرصہ میں افسانہ محدود مفاہیم کے ساتھ جدت اور تجربہ کاری کے مراحل طئے کرتا ہوا ادب میں اپنی موثر اور منفرد شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہا۔

ابتداء میں رومانیت کا رجحان افسانوں پر چھایا رہا۔ اس رجحان کے تحت افسانہ لکھنے والے اہم قلمکار سجاد حیدر یلدارم، نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی اور مجروح گھورکپوری وغیرہ تھے لیکن جب صنف افسانہ کو پریم چند جیسا حقیقت پسند افسانہ نگار نصیب ہوا تو انہوں نے اپنی کہانیوں میں نہ صرف زندگی کی تلخ حقیقت پسندی کو نمایاں کیا بلکہ ان کے معاصرین نے بھی جن میں غلام عباس، ممتاز شیرین، بلونت سنگھ، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، علی عباس حسینی وغیرہ نے بھی مستحکم طور پر حقیقت نگاری کے رجحان کی آبیاری کی۔

1947ء میں ملک کی تقسیم کے تاریخی واقعہ میں افسانہ کو زندگی کی سچائیوں سے

بے انتہا قریب کر دیا۔ تقسیم ہند کے المناک حالات نے ایسے درد و کرب کے واقعات سے قلمکاروں کو دو چار کیا کہ ایک سے بڑھ کر ایک افسانے تخلیق کیے گئے اور صنف افسانہ نگاری کی شناخت قرار دیے گئے ہیں۔ ایسے قلمکاروں میں کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت چغتائی وہ اہم نام ہیں جن کے نام کے بغیر صنف افسانہ کی تاریخ ہم مرتب نہیں کر سکتے۔

1960ء کے بعد حقیقت پسندی کی روایت میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی اور جدیدیت کا رجحان اثر انداز ہوا۔ اس ضمن میں انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجاد، بلراج مینرا، خالدہ حسین، رشید امجد، مرزا حامد بیگ اور کئی اہم افسانہ نگاروں نے جدید رجحان کے تحت افسانے لکھے۔

جدید رجحان دراصل فرد کی تنہائی، سماج کی تنہائی، فرد کا بکھراؤ، خاندانوں کا بکھراؤ کے طور پر لکھا گیا افسانہ ہے جس میں علامت غالب رہی۔ لیکن 1980ء کے بعد افسانہ میں پھر سے کہانی پن اور حقیقت نگاری لوٹ آئی۔ سلیم شہزاد نے اس افسانہ کو بازگوئی کا افسانہ قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بازگوئی کے اس افسانہ میں کردار، واقعات، ماحول اور منظر وغیرہ موجودہ عہد کی تصویر ہوتے ہیں اور اس کے موضوعات بھی موجودہ عہد کے فرد کی زندگی کے مسائل سے اخذ کیے جاتے ہیں۔[1]

1980ء کے بعد تخلیق کیے جانے والے افسانوں میں صاف سیدھا انداز بیان ملتا ہے۔ جدیدیت کے علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''آج کا فنکار بعض چیزوں پر جدیدیوں کے مقابلے میں زیادہ زور دیتا ہے، بعض چیزوں پر کم ۔جن چیزوں پر آج کا فنکار جدیدیدوں سے ذرا مختلف معلوم ہوتا ہے ان میں ایک تو یہ ہے کہ جدیدیدوں کے یہاں تجربہ کا شوق زیادہ تھا اوراسی اعتبار سے ابہام کو وہ لوگ بلاارادہ بھی اختیار کر لیتے تھے۔آج کا فنکار تجربہ کی طرف اتنا راغب نہیں ہے اور ابہام کو وہ ارادی طور پر اختیار نہیں کرتا۔اگر چہ ترقی پسندوں جیسی وضاحت اور دواور دو چار والی منطق کو بھی مسترد کرتا ہے۔2''

یہ بھی حقیقت ہے کہ 1980ء کے بعد کے قلمکاروں نے اپنے پیشرو افسانہ نگاروں سے مکمل طور پر انحراف بھی نہیں کیا بلکہ وہ لوگ اپنی ایک الگ راہ قائم کی ۔ان افسانوں کے اہم موضوعات عصر حاضر کے تقاضے اور ایک اہم اور خاص رجحان تانیثی رجحان کولیکر تقریباً فکشن نگاروں نے اپنی اپنی تخلیقات میں خواتین کے مسائل اور استحصال پر آوازاٹھائی۔

اردو میں افسانوی ادب سے وابستہ خواتین قلمکاروں کی ایک کہکشاں رہی ہے جنھوں نے افسانوی ادب کو اپنی تخلیقات کے ذریعہ اور مستحکم کیا ۔ادبی، تہذیبی اور معاشرتی لحاظ سے جن فنکاروں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے صنف افسانوی ادب کو منور کیا ان میں موجودہ عہد میں صادقہ نواب سحر کا نام محتاج تعارف نہیں۔

صادقہ نواب سحر اپنے افسانوں کے لیے کردار اپنے اطراف واکناف ہی سے اٹھاتی ہیں اوران کے اطراف وہ جو کہانی بنتی ہیں وہ بھی حقیقی زندگی سے اتنی قریب ہوتی ہے کہ افسانہ پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔

صادقہ نواب سحر نے افسانہ نگاری میں قاری کا اعتماد حاصل کیا۔ ان کے افسانوں کا محور وہ عصری انسان ہے جو ذہنی انتشار کا شکار ہے جس کا اثر اُسکی زندگی کی نفسیاتی الجھنوں میں دکھائی دیتا ہے۔ حالات کا جبر و ظلم اس کی انا کو ڈس رہا ہے۔ خونی رشتے بکھیرتے جارہے ہیں۔ ان میں خلوص و محبت کا فقدان ہوتا جارہا ہے جس پر ہماری خوبصورت زندگی کا دارومدار تھا۔ وہ نت نئے انداز اور نت نئے واقعات سے موجودہ صورتحال کی مدد سے انسان کے درپیش مسائل کا حل نکالنا چاہتی ہیں۔

ان کے افسانوں میں ایک اہم موضوع خواتین کے متعلق مسائل بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ دراصل انہیں موضوعاتی اور احساسات پر مبنی افسانے لکھنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں تجربات، مشاہدے، حادثات اور واقعات کا بیان بالکل سیدھے سادے انداز میں نظر آتا ہے اور کہانی اپنے کرداروں کی زندگی کے اطراف گھومتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کردار دراصل حقیقی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے کرداروں کا تعلق انسان اور انسانیت سے ہے جن میں زندگی اور اس سے وابستہ احساسات ہیں جنہیں ہم کسی جگہ یا مقام کی حد تک قید نہیں کر سکتے بلکہ افسانہ نگار روز بہ روز ہونے والے واقعات اور حادثات کا ذکر، رشتوں کا بکھراؤ، خودغرضی، معصوم لڑکیوں کا استحصال، سماج کی بے حسی، رشتوں کی پامالی جیسے مسائل کو بار بار اپنے افسانوں میں موضوع بحث لایا ہے اور یہ ایسے مسائل ہے جو انہیں کہانیاں لکھنے پر اکساتے ہیں۔

خواتین افسانہ نگار :

بانوسرتاج : بانوسرتاج کو افسانے کی ایک توانا آواز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ایک مدت سے افسانہ نویسی کے سبب وہ افسانہ نگار کے طور پر مشہور ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''دائروں کے قیدی'' ہے۔ ان کے دیگر پانچ افسانوی مجموعوں میں اس کے لیے' ذرا سی کمی اور ''دھندلی پر چھائیاں'' ہیں۔

نئے حالات کا سامنا کرتی ہوئی عورت کے کئی روپ ان کے افسانوں میں نمایاں ہیں۔ ان کی تحریروں میں عورت زندگی کے مختلف شعبوں میں حالات سے نبرد آزما نظر آتی ہے۔ ان کے بیشتر کردار بدلتی ہوئی قدروں' رشتوں کے تصادم' سماج کے جبر اور اپنی ناآسودہ خواہشات کے مارے ہوئے لوگ ہیں جنہیں ہم اپنے آس پاس دیکھتے ہیں۔

بانو سرتاج کا افسانہ ''اُس کے لیے'' ایک عورت کی کہانی ہے جسے کوڑھ کے مرض کے سبب آشرم میں داخل کر دیا جاتا ہے اور اپنی بیٹی کو دلہن کے روپ میں دیکھنے کے لیے وہ اس کی شادی کے منڈپ میں فقیروں کی قطار میں آکر بیٹھتی ہے۔

ان کا افسانہ ''کیل میں ٹنگا بچپن'' ان کے افراد کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے جو مختلف حالات میں اپنے بچپن کی فطری خوشیوں سے محروم ہو جاتے ہیں اور بڑے ہو کر نارمل زندگی نہیں جی پاتے۔ یہ ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔

امیرالنساء : بیسویں صدی کے افسانوی ادب میں جن افسانہ نگاروں نے عورت کو بنیاد بنا کر افسانے لکھے انہیں میں سے ایک اہم اور معتبر نام امیرالنساء کا ہے۔ امیرالنساء کا تعلق صوبہ تمل ناڈو کے شہر میل وشارم سے ہے۔ خلوص' تہذیب' شریعت پسندی اور شرافت نفسی ان کے افسانوں میں جھلکتی ہے۔ ان کے افسانے رومان پرور

نہیں ہوتے۔ اگرافسانوں میں کہیں محبت کا ذکرکربھی دیتی ہیں تو یہ محبت عام مرد وعورت کی محبت نہیں بلکہ دیگر رشتہ دار جیسے ماں، باپ، بھائی، بہن کے درمیان جذبہ انسانیت کا اظہار ہوتا ہے۔ امیر النساء نے عورت کی خواہشات کا احترام کیا۔ ان کی دبی کچلی خواہشات کی نمائندگی کی۔

ماں کی محبت کوانہوں نے بہت اہمیت دی ہے۔ان کے افسانوں میں گھریلوفضا اورنسوانی کرداروں کی نفسیات کو بڑا دخل ہے۔ بڑے گھروں کے کرداروں کوپیش کرنے میں انہیں اچھی خاصی مہارت حاصل ہے۔

امیر النساء کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''بند کتاب'' ۱۹۹۸ء میں منظرعام پرآیا جو پندرہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کے اکثر وبیشتر افسانوں کی بازیافت متمول گرانے کے متعدد افراداوران کے مختلف ومتنوع اخلاق واقداراورتہذیبی روابط کے تانے بانے سے ہوتی ہے۔امیر النساء کا طرز اسلوب اپنی الگ انفرادیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں جابجا نسوانی محاوروں کو بڑی خوش اسلوبی سے استعمال کرتی ہیں۔ان کے افسانوں میں مشاہدات کی گہرائی اورسارے فنی لوازمات موجود ہیں۔ موضوعات کی یکسانیت کے باوجود ان کے اسلوب اورفن پردسترس سے افسانہ میں دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے۔

ان کا ایک افسانہ ''کڑوا سچ'' ہے۔ اس افسانے میں ماں کی ذمہ داریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ اس بات کا بھی احساس دلاتی ہیں کہ ایک ماں کس طرح کئی بچوں کی نگہداشت کرسکتی ہے جب کہ اس کے برعکس کئی بچے مل کربھی ایک ماں کی

کفالت کی ذمہ داری قبول کرنے سے کتراتے ہیں۔مجبور ماں کا انتظار کس طرح جان لیوا ہوتا ہے۔ملاحظہ ہوں:

''آمنہ بیگم نوکروں کے رحم وکرم پر تھیں۔اب ان کی حسرت بھری نگاہیں داخلی دروازوں کو تکا کرتیں کہ بھولے سے کسی بیٹی کا چہرہ نظر آجائے مگر بچوں کو اتنی فرصت نہ تھی۔سب کو اپنے شوہر اور اپنے بچوں کی پڑی تھی......اس ماں کے لیے فرصت نہیں تھی جس نے ان پر اس وقت دستِ شفقت رکھا جب یہ مجبور تھیں، نہ اپنے ہاتھوں سے کھا سکتی تھی، نہ اپنے پیروں سے چل سکتی تھی، اللہ کے فضل اور ماں کی عنایات سے یہ اس قابل ہوگئیں تو ماں کی مجبوریاں بے معنی ہوگئیں۔'' 3

ساس اور بہو کا رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے۔عموماً اس رشتے کے نام کے ساتھ ہی ذہن میں ساس کے ظلم وستم اور جبر واستبداد اور بہو کی معصومیت کی تصویر رقصاں ہوجاتی ہے لیکن یہاں امیر النساء نے اپنے افسانے'' پیار کا گھوارہ'' میں ساس رفیعہ بیگم کے کردار کو ایک نیا موڑ دے کر اس طرح پیش کیا ہے کہ ساس سے متعلق جو تصور عموماً قائم ہوتا ہے وہ اچانک ہمدردی کا روپ دھار لیتا ہے۔افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''رفیعہ بیگم نے اپنے بچوں عدیل، فیصل اور حنا کی پرورش پرسکون اور خوشگوار ماحول میں کی ہے جس سے بچے پوری طرح مطمئن ہے۔ وہ لڑائی جھگڑے کے نام سے بھی ناواقف ہیں۔رفیعہ بیگم کی بہو فریحہ کی پرورش بالکل اس کے برخلاف ماحول میں ہوئی ہے۔ وہ فطرتاً مزاج کی شکی اور

بات بات پر اپنے شوہر کو فیصل کو الگ گھر لے جانے پر مجبور کرتی ہے جس کا وہ قائل نہیں ہے۔ بڑوں کا احترام کرنا فریحہ کے بس کی بات نہیں۔ آخر فیصل تنگ آ کر اپنی ماں سے کہتا ہے تو رفیعہ بیگم بڑے ہی صبر و تحمل کے ساتھ اپنے بیٹے بہو کو الگ جانے کی اجازت دیتی ہے۔" 4

ساس کا کردار دیکھیئے :

"رفیعہ بیگم بہ مشکل خود کو سنبھالا۔ دل میں صبر کر کے بولیں ! اس میں اتنا رنجیدہ ہونے کی بات کیا ہے۔ اگر فریحہ کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔ یہاں تمہارا اور میرا کمرہ الگ الگ نہیں ہے؟ گھر الگ ہو جانے سے محبت ختم نہیں ہو جاتی، رشتے ختم نہیں ہو جاتے۔" 5

افسانہ "درد کا احساس" امیر النساء کا ایک اور اچھا افسانہ ہے جس میں انہوں نے عزت واحترام کا سبق دیا ہے اور ساتھ ہی فرسودہ روایتوں کی بے جا عمل آوری کو اجاگر کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ بڑوں کی عزت تو لازم ہے لیکن بڑوں کو چاہئے کہ وہ فرسودہ روایتوں کو توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ یہ افسانہ بھی نفسیاتی رویوں اور بشری جبلتوں کے گرد گھومتا ہے۔

امیر النساء نے اپنے افسانوں اور ناول کے ذریعے اصلاح معاشرہ کا عموماً اور خواتین کے تصورات اور ذہنی تربیت کا خصوصاً منصوبہ بنایا اور انہیں اس کار خیر میں بڑی حد تک سرخ روئی بھی نصیب ہوئی۔

صباء مصطفیٰ : تمل ناڈو کی خواتین افسانہ نگاروں میں صباء مصطفیٰ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کی دو تصانیف ''پہاڑوں کے دامن میں'' اور ''انگاروں کا شہر'' منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ''انگاروں کا شہر'' آپ کی ادبی سرگرمی کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں سترہ افسانے شامل ہیں۔ صبا مصطفیٰ کے افسانے عام مشاہدات پر مبنی اخلاقی واصلاحی طرز کے ہیں۔ آپ نے سماج کے اچھے اور بُرے دونوں رخ مشاہدہ کیا ہے۔ جہاں اچھائیوں کو مزید بہتر بنانے میں کوشاں ہیں وہیں سماج کے گھناؤنے روپ کو قارئین کے آگے بڑے تھیکے اور بے باک انداز میں پیش کیا ہے۔ اور چاہتی ہیں کہ سماج کے اس گھناؤنے روپ کو بہتر بنایا جائے۔

صباء مصطفیٰ کے کردار ہمدردی، قربانی اور انسانی دوستی کے پیکر ہوتے ہیں۔ آپ کا پہلا افسانہ ''گھونگھٹ'' کے دونوں کردار (ترانہ اور اس کی بہن آپا) سراپا ایثار اور ہمدردی کا نمونہ ہیں۔ آپا اپنی ہمدردی اور خلوص کے جذبے کی وجہ سے اپنی بہن ترانہ کو اعلیٰ تعلیم دلاتی ہے اور ترانہ میں بھی احسان مندی کا جذبہ کم نہیں ہے اور جذبہ قربانی تو اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ لہذا اپنی محبت بہن پر نثار کر دیتی ہے۔

عرفانہ تزئین شبنم : اردو ادب کے افق پر عصر حاضر میں ایک مقبول خواتین افسانہ نگاروں میں شہر وانمباڑی سے تعلق رکھنے والی خاتون عرفانہ تزئین شبنم کا بھی ہے، جنہوں نے صرف افسانے لکھے بلکہ انہیں شائع کرنے کا بیڑا بھی اٹھایا اور ان کی تخلیقات منظر عام پر آ کر ارباب فکر وفن سے داد وتحسین بھی حاصل کر چکی ہیں۔ عرفان تزئین شبنم کا پہلا افسانہ ''سحر ہونے تک'' ماہ نامہ بتول ستمبر ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شائع ہوا اس کے بعد تو گویا ایک چسکہ انہیں لگ گیا ہو، پے در پے افسانے لکھتی گیئں

اورتقریباً دودرجن سے زائدافسانے لکھ کراردوادب کے خزانے میں بیش بہا اضافے کئے ۔عرفانہ تزئین کے افسانوں کا ایک مجموعہ ’’چاہے پناہ‘‘ وانمباڑی اردواکیڈیمی کے زیراہتمام مختار بدرؔی، کرشنگری کے پیش لفظ کے ساتھ اپریل ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں چھ(۶) افسانے شامل ہیں۔اس سے پہلےعرفانہ کے افسانے ہندوپاک کےمشہوررسائل وجرائد میں جیسے بتول، مشرقی آنچل، بیسویں صدی، پیام اردو، حیدرآباد، بچوں کا رسالہ کے علاوہ اردوڈائجسٹ لاہوراور پاکستان کے ٹوڈے کیلی فورنیا میں بھی شائع ہوچکے۔عرفانہ کا دوسرا مجموعہ ’’شہرتخیل‘‘ شائع ہوچکا ہےجس میں دس افسانے شامل ہیں۔

ذکیہ مشہدی : خواتین افسانہ نگاروں میں ذکیہ مشہدی کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے بہت کم وقت میں کافی شہرت ومقبولیت حاصل کرلی ہے۔ انہوں نے عورتوں کی نفسیات کا مطالعہ بڑی سنجیدگی سے کیا ہے۔

ذکیہ مشہدی اس عہد کی ایک بڑی افسانہ نگار ہیں۔ان کی کہانیوں کا اچھوتا پن انہیں منفرد افسانہ نگار بناتا ہے۔ ذکیہ مشہدی کی کہانیاں نہ صرف اپنے عہد کی عکاس ہیں۔زندگی کی تلخ حقیقتوں کوفنی تقاضوں سے روبروکراتے ہوئے ذکیہ مشہدی نے عام انسانوں کے دردکونہ صرف سمجھا ہے بلکہ اسے بھی آواز دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں کے مطالعے کے بعدقاری کومحسوس ہوتا ہے کہ یہ اس کی کہانی ہے۔

ذکیہ مشہدی کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔مزدوروں اورعام انسانوں کے مسائل ہوں، اخلاقیات کی بات ہو یا سرکاری افسران کی بدنیتی، برائی اور اخلاق

گراوٹ، جنسی ہوس، بوالہوسی یا سماجی ناسور، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، فرقہ پرستی، اتحاد واتفاق، فرقہ وارانہ فسادات، تقسیم، غربت ومفلسی، تاریخی وراثت، شاہ جاہ وجلال وغیرہ ان کی کہانیوں کے موضوعات ہیں۔ زندگی کے رنگوں کو انھوں نے حتی الامکان کہانی میں پرونے کا کام کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ذکیہ مشہدی کے افسانے پڑھتے وقت قاری کی دلچسپی کسی طور پر کم نہیں ہوتی۔ وہ کہانی کے ذریعے سماج کو آئینے دکھانے کا کام کرتی ہیں۔

نعیمہ ضیاء الدین : نعیمہ ضیاء الدین ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔اس کے بعد کراچی، جرمنی اوراب ایک عرصے سے دوبئ میں مقیم ہیں۔ ابتداء میں نعیمہ نے جرمن اور دوسری زبانوں کی کہانیاں اردو میں منتقل کیں اور صنف افسانہ کی طرف راغب ہوئیں۔

نعیمہ ضیاء کی پہلی کہانی ''مہجور'' ایک ادبی رسالہ ''فنون'' میں 1994ء میں شائع ہوئی۔ان کی افسانہ نگاری کی عمر بہت کم ہے اس کے باوجود ان کے افسانے فنی اعتبار سے پختہ نظر آتے ہیں۔نعیمہ ضیاء الدین کا ایک افسانوی مجموعہ ''منفرد'' 1998ء میں انشا پبلی کیشنز کولکتا سے شائع ہوا تھا۔

ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک روایتی مشرقی عورت ہیں۔اس لیے کہ وہ اپنے افسانوں میں جن اقدار اور روایات کی پاسداری کرتی نظر آتی ہیں وہ دراصل ایک خاتون مشرق کے ہی مزاج کا حصہ ہے۔

منفرد : نعیمہ ضیاء الدین نے افسانہ ''منفرد'' میں پکچر گیلری کے حوالے سے

عورتوں پر ہونے والی مسلسل اور متواتر زیادتیوں کی طرف فنکاری سے روشنی ڈالی ہے اور لبنیٰ کے کردار میں اس مظلومیت کا انکار اور اس کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ دو تہذیبوں کی کشمکش کے علاوہ ہمیں عورتوں پر اس نوع کے ظلم توڑنے کی اجازت دیتے ہیں۔لبنیٰ کو اپنے والد میں اپنے پرکھوں کی وحشت نظر آتی ہے۔اس لیے ان کا خیال تھا کہ:

''چنانچہ وہ اپنی ماں کے نام پیغام چھوڑتی ہے کہ:

''ماں...... میں جارہی ہوں......وقت ملا تو فون کروں گی'' 6؎

وہ سمجھتی تھی کہ دوسری عورتوں کی مانند وہ مختلف نہیں بلکہ منفرد ہے۔اس لیے وہ چلی گئی۔ یہ افسانہ نعیمہ ضیاءالدین کی فن کاری کا عمدہ نمونہ ہے۔

ڈسٹ بن : ڈسٹ بن کے ذریعہ نعیمہ ضیاءالدین نے جنسی بے راہ روی سے پھیلنے بیماریوں پر توجہ مرکوز کرائی ہے تو دوسری طرف ایک بار پھر عورتوں کے مسائل کو اٹھانا ہے۔نہایت معنی خیز جملوں سے قصہ بندی کرتی ہوئی کہانی کو آگے بڑھاتی ہیں۔ چند جملے:

''لڑکیاں تنہا باہر کیوں نہیں جاسکتیں ماں...... اس لیے کہ لڑکیاں پر یا کوڑا بھی اپنے گھر لے آتی ہیں ......اور لڑکے ......اس نے توقف کیا اور ٹھنڈی آہ بھر کر آسمان دیکھنے لگی جیسے فلک سے گلہ گزر رہا ہوا۔

وہ تو اپنا کوڑا بھی دوسروں کے گھر پھینک آتے ہیں...... 7؎

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ نعیمہ ضیاءالدین ایک بولڈ اور بے باک افسانہ نگار ہیں۔

ترنم ریاض : سری نگر کشمیر میں 9 اگست 1963ء میں پیدا ہوئیں۔ ترنم ریاض نے کشمیر یونی ورسٹی سے ایم اے، ایم ایڈ کیا۔ 1973ء سے شعروادب سے وابستہ رہی ہیں۔ ان کی پہلی تحریر سری نگر کے رسالہ ''آفتاب'' میں شائع ہوئی تھی۔ تب سے اب تک وہ فعال ہیں۔

ترنم ریاض کی بنیادی حیثیت افسانہ نگار کی ہے۔ ویسے ان کا ناول ''مورتی'' شائع ہو چکا ہے۔ تین قیدی مضامین بھی لکھتی ہیں جن کا ایک مجموعہ ''چشم نقش قدم'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ انہوں نے آزاد نظمیں بھی کہی ہیں۔ مجموعہ ''پرانی کتابوں کی خوشبو'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔

ترنم ریاض کہانی، پلاٹ، کردار، واقعہ نگاری، جزئیات نگاری، نفسیاتی دروں بینی اور ڈرامائی کشمکش کا وہ پورا خیال رکھتی ہیں۔ جو حقیقت کے قریب ہو اور جس میں نثر کا حسن ہو۔

میرا پیا گھر آیا : یہ افسانہ شمع اور شہیر کی کہانی ہے۔ شہیر اچھا آدمی نہیں ہے، اس بات سے شمع کو اس کے جاننے والوں نے پہلے سے باخبر کر دیا تھا لیکن شمع شہیر کی باتوں میں آ گئی اور شادی ہو گئی اور شمع ایک لڑکی کی ماں بھی بن گئی۔ ادھر شہیر کا اصل چہرہ نقاب کے پیچھے سے ظاہر ہونے لگا۔ وہ ایک غیر ذمہ دار، عورت باز، شرابی اور نہایت ہی دل آزار طنزیہ فقرے کسنے والا آدمی تھا۔ ظاہر ہے شمع کی زندگی اجڑ گئی۔ عین اس وقت شمع کی زندگی میں محبت داخل ہوئی۔ ایک شدید جذبہ عشق جس نے اس کی لخت لخت ہوتی ہوئی شخصیت کو سنبھالا۔ اس عشق کو مصنفہ افسانے کے آخر تک خفیہ رکھتی ہیں۔ شہیر بہت

بگڑتا ہے' غصہ ہوتا ہے طعنے دیتا ہے لیکن شمع اپنے راز کو ظاہر ہونے نہیں دیتی ہیں۔ وہ اس محبت سے اس قدر خوش اور مطمئن تھی کہ اس نے شہیر کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ بیوی ہونے ہونے کے سارے تقاضے پورے کرتی' گرہستی کا ہر کام خوش اسلوبی سے نبھاتی' مگر جب باھی اس وقت ملتا اپنے محبوب سے ملنے چلی جاتی۔ اب شمع کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ایک نئ چمک آ گئی تھی۔ وہ خوب سج کر اپنے محبوب سے ملنے جاتی۔ ادھر شہیر کی صحت دن گرتی جارہی تھی۔

چہرے پر بیماروں کی سی تھکن کے آثار تھے۔ شہیر اپنے اور اس کے عکس کو دیکھتا رہ گیا۔

یمبرزل : افسانہ''یمبر زل'' بھی اس میں شامل ہے۔ یہ طویل افسانہ کشمیر کے حالیہ حالات کے پس منظر میں تخلیق ہوا ہے' جہاں کے ناگفتہ بہ حالات افسانے کے محتویات کا جزو خاص ہو گئے ہیں۔ لازماً ایک ایسا گھرانہ خوشحال اور خوش فکر بھی ہے۔ حالات کی سنگینی سے مسلسل متاثر ہوتا ہے اور نتیجے میں سنگین حالات میں جینے کا عمل ایک بڑی ٹریجیڈی کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ اس طرح یہ کہانی مقامی بھی ہے' گھریلو بھی اور بین الاقوامی بھی

نگار عظیم : نگار عظیم کا اصلی نام مہر نگار ہے اور قلمی نام نگار عظیم ہے۔ ان کی پیدائش 23 ستمبر 1951ء کو یوپی کے شہر میرٹھ میں ہوئی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ'' عکس'' کے نام سے 1990ء میں منظر عام پر آیا۔ دوسرا افسانوی مجموعہ''گہن ''1999ء میں شائع ہوا۔ نگار عظیم نہ صرف ایک بلند پایہ کے افسانہ نگار ہیں بلکہ وہ

ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں۔

جہاں تک نگار عظیم کے افسانہ نگاری کا سوال ہے۔ وہ ایک تانیثی ادب کی معتبر آواز ہیں جنہوں نے اپنی اجتماعی تحریروں سے سماج اورانسانی سیرت میں پنپتے ناسوروں کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں تانیثی عناصر صرف یا جذبات واحساسات اورلب و لہجے کا تعلق ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے افسانوں میں مرکزی حیثیت اوراہمیت عورت کو حاصل ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ ''عورت'' مردوں کے ظلم وستم برداشت نہ کرے بلکہ یہ ایک طرح کا انتقامی جذبہ اپنے اندر پیدا کرے گا تا کہ اس کی محکومیت اورمظلومیت کے دروازے بند ہوجائیں ۔اسی بات کا اظہار وہ اس طرح کرتی ہیں:

''مرد اگر عورت پر ظلم کرتا ہے تو مجھے مرد پر بہت غصہ آتا ہے۔
لیکن جب عورت اس ظلم کو سہتی اور آواز نہیں اٹھاتی تو مجھے
عورت پراس ظلم کرنے والے مرد سے بھی زیادہ غصہ آتا ہے۔
عورت' عورت کے کرب کو زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہے لیکن اس کے
برعکس کبھی کبھی عورت ہی اس ظلم کا سبب بھی بن جاتی ہے۔8

وہ ایک عورت ہونے کے ناطے پدرسری سماج میں عورت کے مقام ومرتبے اور اس کی ترقی وخوش حالی کے لیے نہ صرف فکرمند ہیں بلکہ کافی تگ ودوکرتی ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں مردوں کے وضع کیئے ہوئے اس سماج میں عورت کو ہرجگہ استحصال' ظلم وحشیانہ سلوک اور جبر کے شکنجوں میں جکڑا ہوا دیکھتی ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس نے نگار عظیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نگار نے آج کی نئ پیڑھی کی لڑکی کی سرکشی' بے باکی' خود آگہی اور خود اعتمادی کی تصویر بھی بڑی جرأت سے دکھائی ہیں۔''بیاہ'' میں وہ بتاتی ہیں کہ سماج کی کون سی قوتیں ہرنی کو طوائف بننے پر مجبور کرتی ہیں۔لیکن''ریڈلائٹ''اور''روشنی'' میں وہ عورت کو مرد کے جبر و تحکم سے نجات کی نئ راہیں دکھاتی ہیں۔''روشنی'' کی سنیتا کو کو جب جہیز کے لالچی بَر ملتے ہیں تو وہ مایوس ہو جاتی ہیں۔مایوسی کے اندھیروں میں خدمت خلق کا جذبہ روشنی کی ایک کرن کی طرح نمودار ہوتا ہے اور اسے بڑی تسلی دیتا ہے۔''9

گویا معلوم یہ ہوا کہ نگار عظیم ایک ایسی باغیانہ ذہنیت کے حامل خاتون ہیں جو مردانہ ظلم واستحصال کے حوالے سے کھل کر سامنے آتی ہیں۔ان کی مشہور افسانوں میں ''گہن' سنگین جرم' جشن' زندگی زندگی' فرض' کنشیشن 'ابورشن' وغیرہ مشہور ہیں۔

قمر جمالی : قمر جمالی کا شمار اردو کی مشہور فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے کئی افسانوی مجموعہ منظر عام پر آ چکے ہیں۔''شبیہ''1990ء''سبوچہ''1992ء''سحاب'' 2001ء''زیاب''2001ءوغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔

بقول جوگیندر پال قمر جمالی کی کہانیاں بھی پہلی ہی نظروں میں تبدیلیوں کے ادراک کا بڑا قابل یقیں سماں باندھی ہوئے ہوتی ہیں اور یہی سماں بندی دراصل اپنی پیش رو ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں سے ممیّز کرتی ہیں۔مگر اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ باہر زندگی کے مذکر صفت شعور کے سے پیش کرنے پر حاوی ہیں۔

شائستہ فاخری : شائستہ فاخری کا تعلق خانقاہ شاہ اجمل الہٰ آباد سے ہے۔ادب ' تہذیب اور تصوف ان کو ورثا میں ملا۔شائستہ فاخری بہت تیزی سے کچھ برسوں میں اردو افسانے کے منظر نامے پر رونما ہوئی۔ان کی تیز رفتاری کو دیکھتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''ادب وفن سے ان کا لگاؤ یقیناً گہرا اور پائیدار ہے۔ان کے جو افسانے میں نے پڑھے ہیں ان میں تہذیب کی شائستگی ان معنوں میں اپنے کمال عروج پر ہے کہ فن کا سرا ہاتھ سے ڈھیلا ہوتا نظر نہیں آتا۔ ورثے میں ملا ہوا علمی وادبی مذاق کے ساتھ فنی شعور اور ان کے مرتبے کو بلند کرنا ہے''۔10؎

شائستہ فاخری کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ہرے زخم کی پہچان'' دوسرا مجموعہ ''اداس لمحوں کی خود کلامی'' وغیرہ منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا ہر ایک افسانہ ایسی حیرتیں جگاتا ہے اور زندگی کے اسرار روز اور حالات وواقعات کا اتنا گہرا مشاہدہ لفظ لفظ اور سطر سطر سے منعکس کرتا ہے کہ قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ جیسے افسانہ نگار خود ان وقوعات کی حصہ رہی ہیں۔ان کے دیگر افسانوں میں'' آفندی کا بیٹا'' سرخاب ابھی زندہ ہے' کلر بلائنڈ' آزاد قیدی' منگلا کی واپسی' آخری پہر کا ڈوبتا منظر'' وغیرہ مشہور ہیں۔

صادقہ نواب سحر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خلش بے نام سی ہے'' جو2013ء کو ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤز دہلی سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا ہے جس میں کل 16 افسانے شامل ہیں ۔افسانوں کے عنوانات اس طرح ہیں۔(1) شریاں والی'(2)

میٹر گرتا ہے!' (3) شرارہ' (4) خلش بے نام سی' (5) سلگتی راکھ' (6) اُدھر ہوا فراک' (7) منّت' (8) ٹی شرٹ' (9) نوٹس' (10) چاہے ان چاہے' (11) ہزاروں خواہشیں ایسی' (12) ''خدا کی دنیا بہت وسیع''' (13) پہلی بیوی' (14) ایس ایم ایس' (15) ابارشن' (16) باڈی۔ جو مختلف کہانیوں کی رنگارنگی سے بھرپور ہیں۔ صادقہ نواب سحر پیشہ تدریس سے منسلک ہونے کی وجہ سے انسانی نفسیات کو بخوبی سمجھنے کا ہنر جانتی ہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تخلیقات میں رشتوں کو استوار رکھنے کی ہر ممکن جدوجہد دکھائی دیتی ہے۔ الغرض ان کے افسانوں میں ہندوستان اور یہاں کی تہذیبی اقدار' سیاسی وسماجی حالات کی ترجمانی نظر آتی ہے ۔اس مجموعے میں شامل تمام افسانے اپنے اندر ایک الگ منفرد کشش رکھتے ہیں۔ کسی میں موضوع کی ندرت ہے تو کوئی تکنیکی اعتبار سے عمدہ ہے تو کسی کی کہانی قاری کو چونکا دیتی ہے۔

افسانہ ''شریاں والی'' میں ایک ایسی لڑکی کی زندگی کے نشیب وفراز کو بیان کیا گیا ہے۔ جو صرف نو سال کی ہی تھے کہ اس کی شادی اس کے چالیس سالہ بہنوائی کے ساتھ کردی گئی کیوں کہ نصیبن کی بڑی بہن فلو کا شکار ہو کر دنیا سے چل بسی تھی۔ نصیبن بہت ہی کم عمر تھی اس لیے اسے ساڑی زیب تن کرنا نہیں آتا تھا اس لیے وہ اس کے بجائے ہمیشہ شرٹ شلوار پہنا کرتی تھی اس لیے اس کا نام ''شریاں والی'' پڑ گیا۔

یہ افسانہ مجموعہ کا پہلا افسانہ ہے جو آندھرا پردیش کے ایک ضلع گنٹور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس افسانہ کا ایک مخصوص کردار شریاں والی ہے جس کا حقیقی نام نصیبن ہے ۔شریاں والی کی زندگی کی درد بھری داستان بڑے ہی کرب سے بھری ہوئی ہے۔ صادقہ نواب سحر اس کہانی میں نصیبن کے کردار کی وضاحت اس طرح کرتی ہیں:

> ''جانے کس کی نظر لگ گئی کہ ایک دن اس کی بارہ سال کی بیٹی رات کو ایسے سوئی کہ صبح کو آنکھ نہیں کھول پائی۔شوہر نے غم لے لیا اور کچھ دن بیمار رہ کر چل بسا۔سال بھر بعد زندگی کا سہارا بیٹا بھی تیز بخار میں دنیا سے سدھار گیا۔نصیبن بے سہارا رہ گئی''۔11ؔ

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم الفاظ میں صادقہ نواب سحر نے اپنی کہانی کے ایک کردار کا تعارف کروادیا ہے۔یہ افسانہ اپنے اندر کافی وسعت رکھتا ہے۔اس افسانہ کا مرکزی کردار نصیبن ہے جس کی شادی صرف نو سال کی عمر میں بڑی بہن کے گذر جانے پر اس کے چالیس سالہ امیر بہنوئی سے کردی گئی تھی۔عمر کے بے پناہ فرق کی وجہ سے شادی شدہ زندگی آسودگیوں کا شکار رہی اور قسمت نے بہت جلد اسے بیوہ بھی بنادیا تھا۔اب شوہر کے انتقال کے بعد نصیبن دوسری شادی کا ارادہ کرتی ہے اور حسن مجاور سے دوسری شادی کر لیتی ہے لیکن بہت جلد اس سے علحدگی بھی ہو جاتی ہے۔دراصل حسن مجاور صورت شکل اور چال ڈھال سے اسے جچا نہیں۔اس نے یہی وجہ سے اس سے خلع لے لیا۔کچھ عرصہ بعد گنٹور کے ریلوے کوارٹرس کی ٹی سی مستان خان سے اس نے نکاح کرلیا جو خود بھی شادی شدہ تھا جب مستان کی بیوی بچوں کو اس کے دوسرے نکاح کا پتہ چلا تو بچے اور بیوی نصیبن کو قبول کرنے سے انکار کردیتے ہیں لیکن ادھر شریاں والی ایک بھرپور گھر میں رہنے کی خواہشمند رہتی ہیں اور اپنی ممتا اپنے سوتیلے بچوں پر نچھاور کرنا چاہتی ہے۔اسی خواہش میں وہ ایک دن اپنی سوکن کے گھر چلی جاتی ہے۔اقتباس دیکھیئے:

> ''السلام علیکم'' دروازہ کھولتے ہی اسے پہچان کر چھوٹی بیٹی نے جھٹ سے سلام کیا تو اس نے خوشی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تم رقیہ ہونا بیٹا!''

''جی''

''اماں سے کہنا چھوٹی امی آئی ہیں اوراس نے اپنے دوسرے
ہاتھ میں پکڑا تھیلا رقیہ کے ہاتھ میں تھمادیا۔

''تمہاری آپا کی شادی کے لیے......''

چھوٹی امی!! بچی نے حیرانی سے پوچھا اور تھیلا لے کر اندر چلی گئی۔

ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے' تمہارا جو رشتہ ہے وہ ہمارے ابّا سے
ہے۔اس دروازہ پر پھر قدم نہیں رکھنا''۔ کچھ دیر بعد چار بیٹے
دروازے پر آئے اور اس سے کہہ گئے۔نصیبن کی اس کھلے
دروازے کے اندر ایک قدم رکھنے کی بھی ہمت نہیں رہی۔
کافی دیر تک وہ چوکھٹ کے کنارے بیٹھی رہی اور نصیبن کا دل
ٹوٹ گیا۔

کیا رکھا ہے اس خودغرضی کی دنیا میں اس نے حج کی ٹھان
لی۔ بینک سے تمباکو کے کھیت بیچ کر جمع کیا ہوا پیسہ نکالا گھر بیچا
اور شوہر کے ساتھ حج کو جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اپنا
ساجھے والا گھر اس نے اپنے بھانجے کو بیچ دیا' اس شرط پر
کہ''اگر میں حج سے لوٹ آئی تو مجھے ایک پلنگ کی جگہ دے
دینا''۔[12]

یہ کہہ کر وہ اپنے شوہر کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوجاتی ہے اور کچھ رقم سے وجئے
واڑہ میں ایک گھر بھی خرید کر رکھتی ہے کیوں کہ اس کی سب سے چھوٹی بہن کرایہ کے گھر
میں رہتی تھی۔اس کو یہ گھر دینے کی نیت سے خریدتی ہے اور اپنی بہن سے کہتی ہے:

''مرگئی تو لے لینا اور اگر واپس آ گئی تو مجھے کرایہ دے دینا۔

دونوں بہنوں کی آنکھیں ڈبڈ بائی۔13

دراصل قدیم زمانہ میں حج کے لیے پانی کے جہاز کا سفر بڑا مشکل تھا اور لوگ جب حج کے لیے سفر پر روانہ ہوتے تھے تو اپنے اہل خانہ سے اور رشتہ داروں سے مل کر غمگین ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شریاں والی کی بھی اپنی بہنوں سے مل کر آنکھیں بھر آئیں۔

جب وہ پانی کے جہاز سے حج سے واپس آئی تو کچھ ہی دنوں بعد مستان خان کا انتقال دل کا دورہ پڑنے سے ہو گیا۔ اس کی پہلی بیوی اور بچے مستان خان کی لاش اٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ اب پھر سے شریاں والی قسمت کی ماری تن تنہا ہو گئی۔ کبھی وہ اپنے رشتہ داروں کے یہاں تو کبھی دوسرے جان پہچان کے لوگوں کے یہاں رہ کر اپنے دن کاٹ رہی تھی۔ ایک دن وہ اسی طرح گنٹور سے ورنگل چلی گئی۔ اور وہاں کے ایک شاندار مکان کے آگے ٹھہر کر بھیک مانگ رہی تھی۔ اچانک کیا دیکھتی ہے اس کے تیسرے شوہر مستان کی بیٹی رقیہ شاندار مکان کے اندر سے اسے نظر آئی اور شریاں والی نے اسے فوراً پہچان لیا اور رقیہ بھی فوراً پہچان لیتی ہے اور اسے اپنے مکان کے اندر لے جاتی ہے۔

''رقیہ ہو بہو باپ جیسی تھی۔ نصیبن کو مستان خان بری طرح یاد آ گیا۔ دسترخوان پر بگھارا کھانا، مرغی کا قورمہ، امباڑے کی کھٹی بھاجی اور تلوی ہوئی کھاری مچلی کا مزہ لیتے ہوئے نصیبن نے سوچا رقیہ کی شادی بھی کم عمر میں ہوگئی۔ شوہر اسے بہت

چاہتا تھا مگر بچوں کا سکھ اس کے نصیب میں نہیں تھا۔''14؎

جب رقیہ کو ڈاکٹر صاحبہ کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی تو وہ اپنے شوہر کا گھر چھوڑ کر کہیں اور چلی جاتی ہے تا کہ اس کا شوہر دوسری شادی کر لے لیکن جب اس کے شوہر بابو قوال کو رقیہ کے گھر چھوڑ کر چلے جانے کی وجہ معلوم ہوتی ہے تو وہ بیقرار ہو جاتا ہے۔اقتباس دیکھیئے:

''میں نہیں رہتا تیرے بغیر......رقیہ......میں نہیں رہتا تیرے بغیر......میں نہیں جیتا تیرے بغیر......رقیہ......نانی میں نے اس کے کہنے سے ہی بڑی بیوی کو اچھار کھا تھا۔اس کو بھی الگ گھر دیا تھا۔مجھے نہیں چاہئے بچّے وچّے!''
اس نے پھر تڑپ کر آسمان کی طرف دیکھ کر آواز لگائی میں نہیں رہتا تیرے بغیر......رقیہ''۔15؎

رقیہ ماں نہیں بن سکتی تھی اس لیے وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر چلی گئی اور اپنے سابقہ شوہر سے معافی مانگتی ہے اور اسکے ساتھ زندگی گذارتی ہے۔رقیہ کا پہلا شوہر اسے معاف کر دیتا ہے اس طرح صادقہ نواب سحر نے ایک عورت کا اپنے کیئے پر کفارہ ادا کرنا ظاہر کیا ہے تو دوسری طرف عورت کے دل میں چھپی ہوئی پاک محبت کا جذبہ جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ پر ملامت کرتی ہے اور آخر کار اپنے چاہنے والے شریف شوہر کے پاس واپس چلی جاتی ہے اور نصیبن جو اس افسانے کا مرکزی کردار ہے اس کا نصیب ہی واقعی ایسا ہے کہ تین شادیاں کرنے کے باوجود بھی کسی طرح اسے سکون اور اطمینان بخش زندگی نہیں مل سکی۔وہ در در بھٹکتی مصیبت اٹھاتی ہی رہی۔مقامی زبان اور انداز کی اس افسانے میں بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔زبان و بیان کے لحاظ سے یہ افسانہ

بہت کامیاب افسانہ ہے۔

افسانہ ''میٹر گرتا ہے'' میں ممبئی شہر کے ایک ٹیکسی ڈرائیور اور مسافر کے درمیان دوران سفر ہونے والی باتوں کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے افسانہ ہے۔ آج مہنگائی کے اس دور میں عام آدمی کے لیے جینا آسان نہیں ہے۔ ڈرائیور کی ٹیکسی میں کوئی ادھیڑ عمر کا بزنس میان بیٹھا ہے تو ٹیکسی ڈرائیور اپنے بچے کی بیماری کی بات کرتا ہے' دوا مہنگی ہے۔ بجلی کا بل' پانی' گھر نہ لے سکنا وغیرہ بہت سی تکلیفوں کے بارے میں بتاتا ہے۔ ایک ٹیکسی والا محنت کرنے کے باوجود بھی روزمرہ کی ضرورتیں پوری نہیں کر پاتا۔ اپنی بپتا سناتے ہوئے وہ کہتا ہے۔ اقتباس دیکھیئے :

''صاحب کچھ بھی بولو۔ ممبئی میں تو ابھی ٹیکسی چلانے کا مزہ نہیں رہا۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' مسافر نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''ارے صاحب' ممبئی میں اتنا ٹرایفک ہوگیا ہے کیا بولے گا !......مزہ بولے تو سالا ایئر پورٹ کا بھاڑا مارنے والے لوگ کا ہے۔ ایئر پورٹ سے واشی جاتا ہے...... ایئر پورٹ سے کولابہ جاتا ہے۔ ہیرو لوگ سٹائل مارتا ہے......سٹی میں تو ٹیکسی چلانے کا مزہ نہیں ہے صاحب۔ زندگی بھر ٹیکسی چلا کے بھی ممبئی میں لاکھ روپیہ کا ایک جھونپڑی نہیں لے سکتا۔ بس دو ٹائم کا کھانا مل جاتا ہے۔''

''اوہ !'' ٹیکسی ڈرائیور کو لگا جیسے مسافر نے احساس کے ساتھ 'اوہ'' کہا ہو۔ آخر کچھ کم' کچھ زیادہ کے فرق سے ممبئی میں

سب کی کیا یہی کہانی ہے! اس نے سوچا۔ اُسے مسافر سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ اس کا حوصلہ بڑھا اور اس نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

''صبح چار بجے اٹھتا ہوں تو رات ساڑھے گیارہ بجے سوتا ہوں۔ اوپر سے بجلی کا دو مہینوں کا دو ہزار کا بل آیا ہے۔ کمپلینٹ کرنے گیا تو بیسٹ والا بولا۔'' ڈرائیور صاحب' پہلے بِل بھردو' بعد میں انکوائری ہوئے گا۔' کیا بولنے کا صاحب! دو ہزار کدھر سے آئے گا۔ نہیں بھرا تو بجلی کاٹ دے گا۔''

''اور نہیں تو کیا!'' کہہ کر مسافر چپ ہوگیا مگر ڈرائیور اپنی دھن میں کہتا رہا۔

''ایسا ہی پانی کا کنیکشن کٹ گیا ہے۔ صبح چار بجے اُٹھ کر میونسپلٹی کے نل پر پانی بھرنے جانا پڑتا ہے۔ پانچ بجے سے عورت لوگ کا ٹائم ہوتا ہے نا! بہت کِٹ کِٹ چک چک رہتا ہے۔......ابھی دیکھو صاحب' وہ سامنے سے جو تیسرا جھاڑ دِکھتا ہے نا؟'' اسی وقت سگنل کی لال بتّی دیکھ کر ڈرائیور نے ٹیکسی رُکا دی۔ مسافر نے ٹیکسی کے باہر نظر دوڑائی۔ پڑوس میں ایک دوسری ٹیکسی سے ایک بوڑھا شخص اُتر رہا تھا۔ ایک موٹر سائیکل اُسے چھو کر آگے بڑھ گئی۔ مسافر نے ہرے رنگ کی مینارہ مسجد سے آگے نظر دوڑائی اور مسجد سے لگی دوکانوں سے اُٹھتی مٹھائیوں اور خستہ نان خطائیوں کی خوشبو دھیرے

سے اپنی سانسوں میں اتار لی۔

ہاں......اتنی دور جانا پڑتا ہے پانی لانے کو......'' ڈرائیور نے سانس لے کر کہا۔

''رات کو اتنا تھک کر آتا ہے' پھر صبح کو پانی بھرنے کا ڈیوٹی ......بچّہ لوگ کو بولتا ہے تو بولتا ہے' پپّا! ہم لوگ کو شرم آتا ہے۔ میں بولتا ہوں' تم لوگ کو نہانے کو شرم نہیں آتا' پانی بھرنے کو شرم آتا ہے! ب میں تم لوگ کا باپ رہ کے میرے کو شرم نہیں آتا ہے تو تم لوگ کو کائے کو آتا ہے؟' تو بولتا ہے' پپّا تم کو چلتا ہے' ہم لوگ کو نہیں چلتا۔' بولو......ابھی کیا بولنے کا؟''

''چہ......چہ......'' مسافر نے افسوس کیا۔

''اتنی محنت اُپن کائے کو کرتا ہے؟......اس لئے نا کہ بچہ لوگ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ اپنا نہیں تو اِن لوگوں کا زندگی بن جائے......ہے نا صاحب؟''

''ہاں سچ ہے۔'' مسافر نے سر ہلایا۔ پتہ نہیں کیوں ڈرائیور کو محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا ہے۔

مسافر خاموش رہا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو لگا کہ وہ شاید اس کے دور میں اپنا درد محسوس کرنے لگا ہے!

''کل رات تو ایسا ہوا کہ ساڑھے گیارہ بجے گھر پہنچا۔ عورت کھانا گرم کرنے کو گئی تو اُپن سو گیا۔ بِنا کھائے پیئے ہی سو گیا۔ سیدھا صبح کو ہی اُٹھا۔''

''اوہ!......اچھا......مجھے منیش مارکیٹ کے سامنے

اتار دینا......'' مسافر نے ایک لخت کہا تو ڈرائیور کو لگا کہ شاید
اُس کا درد پوری طرح سے محسوس کرنے سے پہلے ہی مسافر کی
منزل آ گئی ہو!۔16؎

یہ افسانہ ایک ٹیکسی ڈرائیور کی روزمرہ کی زندگی اور اس کے مسائل پر مبنی ہے۔ یہ افسانہ تو ممبئ کے گرد و نواح کا ہے مگر اس مہانگر میں کئی چھوٹے شہر ہیں' انہیں گاؤں بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ممبئ ضلع کے حدود میں آتے ہیں۔ ممبئ کے ایسے علاقوں میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے آ کر لوگ بس جاتے ہیں اور روزی روٹی کے لیے مزدوری اور چھوٹے موٹے کام کر کے گذر بسر کر لیتے ہیں ۔افسانہ نگار نے ممبئ میں بچپن سے شادی تک کے دن گزارے ہیں ۔ وہ ان کا مائیکہ ہے ۔وہ وہاں کے حالات سے خوب واقف ہیں۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور بھی باہر کا ہے۔لیکن لمبے وقت سے ممبئ میں بستے ہوئے ممبیا بولی بولتا ہے۔ اپنے مسافر کو وہ اپنی بپتا کچھ اس طرح سناتا ہے' مکالمہ دیکھیئے :

'' صبح چھوکرے کو پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا۔
سرکاری ڈاکٹر لوگ کا ہڑتال چلتا ہے نا! جبھی سے سالے
پرائیوٹ ڈاکٹر لوگ کا مزا ہو گیا ہے۔ فیس پانچ سو روپۓ
ہے۔ پَن اُپن سے دو سو روپیہ ہی لیا...... پہچان والا ہے
نا...... جانتا ہے کہ اُپن ڈرائیور ہے۔ جاستی نہیں دے سکتا......
بولتا تھا' اچھا کیا پہچان رکھا اور آیا آوپر سے تھینک یو بھی
بولا۔''17؎

اس اقتباس سے پتہ چلا کہ صادقہ ممبئ کے اُپ نگروں کے کرداروں کے مسائل

کوبھی جانتی ہیں اوران کی ممبیا بھاشا کوبھی۔ یہ معلومات اسی وقت کسی ادیب کو ہوسکتی ہے جب وہ ان کی زندگی کو ہمدردی سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہو۔ایسی کئی مثالیں صادقہ نواب کے افسانوں میں مل جاتی ہیں۔

''میٹر گرتا ہے'' اس مجموعے کا ایک اہم افسانہ ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار ممبئ شہر میں ٹیکسی ڈرائیور ہے جو متوسط طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔مصنفہ نے ٹیکسی ڈرائیور کے بنیادی مسائل کو اس افسانے میں پیش کیا ہے۔ڈرائیور کا حال روز کنواں کھودنے اور روز پانی پینے والا تھا۔اسی میں اس کے بیٹے کی طبعیت بگڑ جاتی ہے' جس سے ٹیکسی ڈرائیور کی حالت خراب ہوجاتی ہے۔وہ اپنی اوراپنے بچوں کی زندگی کو خوش حال بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے' جس کی وجہ سے وہ اپنا زیادہ تر وقت ٹیکسی چلانے میں ہی دیتا تھا۔اس وجہ سے اس کی بیوی اس سے ناراض رہتی تھی۔

اس افسانے میں ممبئ کے متوسط طبقے کے لوگوں کی زبان استعمال کی گئی ہے جس سے کہانی میں ایک نیا پن پیدا ہوگیا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اتنی محنت اپُن کائے کو کرتا ہے؟......اسی لیے نا کہ بچہ لوگ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔اپا نہیں تو ان لوگوں کا زندگی بن جائے...... ہے نہ صاحب......!''[18]

اس افسانے کے ذریعہ افسانہ نگار غریب انسانوں کو پیش آنے والے مسائل کا بیان کیا ہے اور ممبئ شہر کی مصروف ترین زندگی وہاں کی مہنگائی' وہاں کا رہن سہن' تہذیب وتمدن اور وہاں کی زبان کو بڑے سلیقے سے افسانہ میں چابکدستی سے روشناس کیا ہے۔

افسانہ ''شرارہ'' میں صادقہ نواب سحر موجودہ عہد کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی فکری رومان اور کسی معاملے میں ذاتی انتخاب کو فوقیت دینے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کہانی کی ابتدا بہت ہی المناک ماحول میں ہوتی ہے جس میں کہانی کی ہیروئن رعنا کے دو بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہے۔ رعنا سب سے چھوٹی اور ماں باپ کی لاڈلی بیٹی ہے۔ والدین نے اسے کچھ زیادہ ہی آزادی بھی دے رکھی ہے۔ آزاد مزاج ضرور ہے لیکن مشرقی شرم وحیا کو اس نے خیر باد نہیں کیا۔ ماں باپ اور بھائی بہنوں نے بہت کوشش کی کہ اس کی شادی کے سلسلے میں اس کی رائے معلوم کرلی جائے اس سلسلے میں اس کے چچازاد، ماموں زاد بھائی جاوید ہے جس سے اس کی کبھی نہیں بنتی تھی۔ رعنا جب والد کی آفس سے لوٹ رہی تھی تو سگنل پر اس کی بس رکی وہ نیچے جھانک کر دیکھی تو نیچے والی سڑک پر بھگدڑ مچی ہوئی تھی، ٹرایفک جمع ہو چکی تھی، چیخوں کی آوازیں آرہی تھی اسٹیشن پر کہیں بم پھٹا تھا، لوگ دھڑا دھڑ گرنے لگے تھے۔ اتنے میں رعنا کیا دیکھتی ہے کہ بم پھٹا اور جاوید بھی چلتی ٹرین سے گر گئے کسی طرح وہ گھر پہنچی اور پھوٹ پھوٹ کر روئے جارہی تھی بڑی آپا اور چھوٹی آپا نے جب اسے حواس باختہ دیکھا تو دوڑی دوڑی ان کے پاس آئیں پھر اپنے اماں کے پاس پہنچ کر بتایا ماں بھی گھبراہٹ کے عالم میں جھنجھوڑ کر پوچھنے لگے کہ آخر کیا ہوا۔ رعنا ابا سے ملنے آفس گئی تھی کہیں ابا کو تو کچھ نہیں ہوا۔ رعنا نے بتایا کہ ابا کو تو کچھ نہیں ہوا لیکن جاوید کا ایکسڈنٹ ہو گیا یہ سن کر سبھی لوگ رونے لگے۔ رعنا نے کسی طرح بتایا کہ بم پھٹا تھا۔ لوگ تفصیل جاننا چاہتے تھے لیکن رانا کو ہوش نہیں تھا کسی طرح خادمہ سے پانی لاکر پلایا گیا تب اس نے پوری روداد سنائی سن کر سبھی لوگ بدحواس ہو گئے۔ ابھی گھر کا پورا ماحول اُسی افراتفری اور انتشار میں تھا

کہ دروازے کی گھنٹی بجی ۔خادمہ نے دروازہ کھولا ۔جاوید اندر داخل ہوا سبھوں کو حیرت ہونے لگی تھی ۔ بڑی آپا نے بم کا ذکر کیا۔ جاوید نے پوچھا کہ بم کی خبر یہاں تک کیسے پہنچی اس نے بتایا کہ بم تو نہیں تھی بم کی افواہ تھی بیس پچیس لوگ زخمی ہوئے میں ٹرین سے کود گیا لیکن یہ سب خبر اتنی جلدی یہاں کیسے پہنچی ۔کہانی کے اختتام پر افسانہ نگار نے ایک نوجوان دل کی بے بسی اور بے کسی کو اس طرح پیش کیا؟ جس میں المنا کی بھی ہے اور رومانیت بھی موجود ہے۔

''رعنا نے جاوید کو دیکھا مگر اس کا اثر کچھ دیر سے ہوا۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ پھر وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں دوڑی اور جاوید سے لپٹ گئی۔ جاوید مجھے معاف کردو' اس کے بھولے چہرے پر زلفیں اڑی ہوئی تھیں' سوجی ہوئی آنکھوں سے آنسو رواں تے اور بے چین نظریں جاوید کے خوبرو چہرے پر ٹکی ہوئیں۔ جاوید گھبرا گیا اور رعنا کا حسین چہرا اس کے بازوؤں میں ڈھلک گیا۔ اب جاوید بری طرح پریشان ہوگیا۔ یہ لڑکی ہے! صبح جھگڑ رہی تھی اور اب اتنے میں ان کی نظر اپنی پھوپھی جان' چھوٹی آپا اور بڑی آپا پر پڑی۔امی کی رم جھم آنسو برساتی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور چھوٹی اور بڑی آپا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ 19؎

جب وہ اپنے ماموں زاد بھائی کو ٹرین سے گرتے دیکھتی ہے تو بے تحاشا رونے لگتی ہے جبکہ جاوید اور رانا کے بات بات پر جھگڑتے ہوتے تھے ۔کہانی میں انسانی نفسیات کی گتھیوں کو بھی سلجھایا گیا ہے۔اکثر یہ ہوتا ہے کہ انسان جسے زیادہ پیار کرتا ہے'

اس سے سب سے زیادہ جھگڑا کرتا ہے ۔اس کا ٹائٹل بھی بمعنی ہے ’شرارہ‘ یعنی چنگاری۔محبت کی ایک چنگاری کہیں اس کے دل میں دبی ہوئی تھی جس سے وہ خود بھی بے خبر تھی۔‘‘

کہانی کی ابتدا رعنا کے رونے سے شروع ہوتی ہے اور کہانی کا اختتام رعنا کی مسکراہٹ اور خوشی پر ہوتا ہے۔افسانے میں جو بیانیہ زبان استعمال ہوئی ہے‘اس میں لہجہ کا برتاؤ قابل توجہ ہے اور لہجے میں ڈرامائی خاصیت موجود ہے‘‘۔

’’خلش بے نام سی‘‘اس مجموعے کا اہم افسانہ ہے۔اس افسانے میں مصنفہ نے عورت کی حسیت کو موضوع بنایا ہے۔افسانے میں تین کردار ہیں روبی‘ صبیحہ اور نواز۔ روبی‘صبیحہ بچپن کی سہلیاں ہیں اور نواز روبی کا چہیتا بھائی۔ایک بار صبیحہ دس دن کے لیے ممبئ میں رہ رہی اپنی سہیلی روبی کے گھر آتی ہے۔صبیحہ کے آنے پر روبی تو خوش ہوتی ہے اور ممبئ شہر گھمانے لے جاتی ہے‘ لیکن اس کی طبعیت خراب ہونے کی وجہ سے وہ صبیحہ کو ممبئ شہر گھومانے کی ذمہ داری اپنے بھائی نواز کو دے دیتی ہے‘ ساتھ میں دونوں کے کافی وقت گزارنے سے اچھی دوستی ہوگئی۔ یہ دوستی روبی کو اچھی نہیں لگی......اسے لگا کہ یہ میرے بھائی کو اپنے پیار میں پھنسا رہی ہے‘ جس سے میرا بھائی مجھے نظرانداز کرنے لگا ہے۔روبی کے رویہ میں تبدیلی دیکھ کر صبیحہ نے اس کی وجہ جاننی چاہی تو اس نے اسے جھڑک دیا۔صبیحہ نے اسے اس کی بیماری سمجھ کے بھلا دیا۔ جب اس کی چھٹی پوری ہوگئی تو وہ اپنے گھر چلی گئی۔وہاں پہنچ کر وہ نواز اور روبی کا انتظار کرنے لگی کہ جیسے ہی روبی کی طبعیت ٹھیک ہوگی وہ نواز کو لے کر امی سے میرا ہاتھ مانگنے آئے گی اور ہوا بھی یہی کچھ دنوں کے بعد روبی‘ صبیحہ کی امی سے اپنے بھائی نواز کے لیے اس کا ہاتھ

مانگنے گئی، لیکن صبیحہ کی امی یہ کہہ کرانکار کر دیا کہ اس کا رشتہ تو میں نے اپنی سہیلی کے بیٹے سے طئے کر دیا ہے۔ جب کہ یہ سچ نہیں تھا۔ وہ لوگ جواب پانے کے بعد واپس لوٹ گئے ۔نواز کی گاڑی دھول کو چیرتی ہوئی واپس جارہی تھی تو صبیحہ کو لگا گاڑی جیسے اس کے دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ صبیحہ کے پوچھنے پہ اس کی امی نے کہا تو اس گھر میں خوش نہیں رہ پائے گی۔ جب دس دن میں روبی کو تجھ سے جلن ہونے لگی تو اس گھر میں اپنی پوری زندگی کیسے بتائے گی۔''

صادقہ کے افسانوی فن میں تجسس کی خوبی کا حسن بھی ہے۔کلائمکس میں چونکانے کا فن بھی، تمام افسانوں کے موضوعات پر اظہار تو ممکن نہیں، اس لیے یہ کہنا مناسب ہے کہ صادقہ اپنے افسانوی فن میں ماہر اور کامیاب ہیں۔آخر میں ان کے افسانوی فن کی ایک خوبی کا ذکر ضروری ہے، وہ یہ کہ صادقہ کی افسانہ نگاری میں مکالموں کا بڑا دخل ہے۔ مکالموں کے ذریعہ افسانہ اپنے کرداروں کے ساتھ پرت در پرت کھلتا ہے۔ مکالمے چست اور درست ہوتے ہیں، کچھ مکالمے ملاحظہ فرمائیں:

''نہیں روبی میں کہیں نہیں جاؤں گی''۔صبیحہ آہستہ سی بولی

''ہاں بھئی مجھے بھی اعتراض ہے''

''کیوں بھائی جان''؟

''نا بابا جوان لڑکی کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھیں گے تو لوگ کیا کہیں گے۔''

''دقیانوسی مت بنئے بھائی جان۔ بچی دعائیں دے گی آپ کو''۔

''اچھا؟ پھر تو قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے!''

''یہ آپ تین بار قبول ہے یہ کیوں کہہ رہے ہیں! میں کوئی
قاضی نہیں۔''

''گواہ تو بن سکتی ہونا؟''

''صرف گواہ! واہ بھائی جان خوب کہی آپ نے بھی!'

دونوں کو اپنے متعلق اتنی بے باکی سے باتیں کرتے دیکھ کر
صبیحہ اٹھ کر باغ میں چلی آئی۔20؎

افسانہ ''خلش بے نام سی'' میں عورت کی بے بسی' انا اور خودداری کو بہت ہی حسین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

کہانی ''سلگتی راکھ'' ایک ایسی شادی شدہ نوجوان عورت کو المیاتی زندگی کو ششیں کرتی ہے جس کا اسے وہم بھی نہیں تھا۔ کہانی کی راوی ''شالنی'' ایک پڑھی لکھی عورت ہے جو زمانے میں اپنے کلاس فیلو ونود سے محبت کرتی تھی۔ دونوں کا عشق پروان چڑھنے لگا' دونوں کی ماوؤں نے شادی کے لیے منظوری دے دی لیکن ونود نے وہ تمام باتیں بتادیں جس کو سننے کے بعد کہانی کی ہیروئن سکتے کے عالم میں پڑگئی۔ ونود نے بتایا کہ ''میری ماں عشق میں دھوکہ کھا چکی ہے'' اور وہ اس کی ناجائز اولاد ہے ونود کی بات سننے پر شالنی پر عجب کیفیت طاری ہونے لگتی ہے وہ سوچتی ہے کہ شادی کے بعد ونود سے ہونے والی اولاد کو لوگ حرامی کا بچہ کہیں گے۔ وہ اپنی ماں سے کہہ دیتی ہے کہ ونود پسند نہیں ہے۔ کچھ دنوں کے بعد شالنی کی شادی شرد سے ہوجاتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب وہ سسرال میں شوہر اور اس کے ساتھ تھی تو ایک لفافہ ڈاکیہ نے دیا جس پر مسز کمار ۲ نیوجیون کالونی' بمبئی۔۵۲ کا پتہ تھا شالنی نے خط چاک کردیا جو اس کی ساس موہنی کے پرانے عاشق کی طرف سے تھا' جس میں محبت کی پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے شکریہ

کا اظہار تھا کہ اس کے پریم کی نشانی شرد کو پالا پوسا اور بڑا کیا اور شادی کر دی۔ خط کے آخری حصے میں محبت وعقیدت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی محبوبہ کو دیوی گردانا اور خود کو گناہ گار۔ اس نے معافی بھی مانگی اور یہ بھی تمنا کی کہ بیٹے کا منہ دیکھنے کو وہ جیون بھر ترستا رہا۔ اس کے لیے یہ بڑی سزا ہی ہے۔ خط پڑھنے کے بعد شالنی کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ قسمت کے آگے انسان مجبور ہے جس وجہ سے اس نے ونود کو چھوڑا تھا وہی روگ یہاں بھی ہے۔

''سلگتی راکھ'' اس افسانے میں مصنفہ نے عہد حاضر میں مرد عورت کے مابین جنسی تعلقات کے تحت وجود میں آرہے غیر اخلاقی رشتوں کی وضاحت کی ہے۔ یہ افسانہ عورت کی گھٹن کو واضح کرتا ہے جہاں مرد عشق کے پردے میں عورت کو اپنی بوالہوس کا نشانہ بناتے ہیں جس کے نتیجے میں لڑکی بن بیاہی ماں بن جاتی ہے جسے ہمارا معاشرہ قبول نہیں کرتا وہ عورت کے اوپر ہی انگلی اٹھاتا ہے۔ سماج کی طنز آمیز نگاہوں کا سامنا بھی عورت کو ہی کرنا پڑتا ہے۔

صادقہ نواب سحر نے اپنے افسانوں کے ذریعہ معاشرے کی اصل شبہ کو ظاہر کیا ہے، وہ انسانی باطن میں پوشیدہ اس کے احساس شعور کو بھی جھنجھوڑ دیتی ہیں۔

افسانہ ''ادھڑا ہوا فراک'' خاصہ اہم افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ایک نوعمر پولیو زدہ لڑکے کے عشقیہ جذبے کو عیاں کرتا ہے۔ یہ ایک جذباتی کہانی ہے، جس میں ایاز اپنی بھابھی سے اپنے اس پاکیزہ جذبے کے بارے میں بتاتا ہے وہ ایک خوبصورت لڑکی کی محبت میں گرفتار رہے، اپنی اور اس لڑکی کی ملاقات کو تفصیل سے بیان کرتا ہے اور معلوم

کرتا ہے کہ کیا اس خیال میں وہ لڑکی بھی اس سے محبت کرتی ہے یا نہیں؟اس پر بھابی ایاز کو سمجھاتی ہے:

'' ایاز وہ بہت خوبصورت لڑکی ہے اور حسین لڑکیاں ......
بھابی......اس نے جیسے پورا مفہوم سمجھ کر بات کاٹ دی۔
'' بھابی وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔بس اسکول' گھر کے کام کاج اور عبادت۔''
''ٹھیک ہے مگر سولہ سترہ برس کی عمر کی محبت بعد میں عقل' سمجھ اور ذمہ داری کی نذر ہو جاتی ہے۔تم کیا سمجھتے ہو' وہ تم سے شادی کر لے گی؟'' 21؎

بھابی کے ان الفاظ کو سن کر ایاز اندر کچھ ٹوٹ گیا۔ایاز اس لڑکی کی محض توجہ یا جنسی کشش کو اپنے میں پاکیزہ محبت گردانںے لگا تھا۔اب حالات اور اپنی حیثیت کا محاسبہ کر کے اس تصور سے جینے لگتا ہے کہ وہ لڑکی بھی اس سے محبت کرتی ہوگی۔صادقہ نواب سحر کے کردار اپنی ناکام اور تشنہ آرزؤں کے ساتھ زندگی سے سمجھوتہ کر کے جینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

انہوں نے اپنے اردگرد چلتے پھرتے کرداروں میں سے ان مفلوج ومعذور انسانوں کے کرب کو افسانہ کا موضوع بنایا ہے جس کو عام انسان نظرانداز کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

افسانہ ''ادھڑا ہوا فراک'' میں ایک پولیو زدہ کردار کی محبت کی روداد بیان کی گیء ہے۔کہانی کا مرکزی کردار ایاز ایک نوجوان لڑکا ہے جو کسی فرم میں ملازم ہے۔وہ کمر

کے نیچے سے پولیوزدہ ہے۔اپنے دور کے رشتہ میں ہونے والی بھابھی مینا سے اُسے بہت قربت ہے اور وہ اپنے محبت کی روداد مینا کو بتاتا ہے۔ایاز دراصل اپنے دوست سمیر کی سہیلی سے محبت کرتا ہے اور وہ بھی دل سے اسے چاہتی ہے۔اس کہانی میں صادقہ نواب سحر نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ چاہے وہ معذور ہی کیوں نہ ہولیکن اس کے دل میں بھی محبت کے متعلق نرم گوشہ ہوتا ہے لیکن معذوری اس کے لیے دیوار بن جاتی ہے۔اس کہانی میں انہوں نے معذور افراد کے درپیش مسائل کو بیان کیا ہے۔

''منت'' کہانی کا پلاٹ بالکل اچھوتا ہے۔سماج ہر طریقے سے عورت کو ہی سزادیتا ہے اور قصوروار ٹھہراتا ہے' چاہے اس میں عورت کا ذرا بھی قصور نہ ہو۔مکتا خوبصورت ہے۔ہبن اس سے پیار کرتا ہے لیکن قدرت نے اسے ماں بننے کی سعادت سے محروم رکھا ہے۔اس لیے بہن کی ماں مکتا سے اس کی شادی نہیں کرسکتی۔ہبن کی ماں رشتے کے لیے آئی تھی پر مکتا کی ماں نے سچ بات اسے بتادی۔اس نے بیٹے کو سمجھایا:'' سن بیٹا' کسی کو معلوم نہیں ہوتا یا یہ ہم دوسرے گاؤں کے ہوتے تو بات اور تھی۔اب لوگ پوچھیں گے نہ کہ تیرے بیٹے میں کیا دوش تھا کہ آنکھوں دیکھی مکھی نگل لی مکتا کی ماں پنڈ ہر پوجا کرو ٹھل پانڈورنگ سے منوتی مانگتی ہیں کہ میری بیٹی کو شادی کے قابل بنادے۔وقت گزرتا رہا۔بھائی کی بیٹی کو دیکھنے کے لیے رشتے والے آنے والے تھے۔مکتا اپنی بھابھی کا گھونگھٹ سر پر ڈال کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ماں کو بیحد دکھ ہوا' وہ بیمار پڑ گئی اور ان کے پاؤں بھی اکڑ گئے۔ہبن مکتا سے ملنے آیا تھا۔پچیس سال پہلے وہ امریکہ چلا گیا تھا۔مکتا کو دیکھ کر اس نے کہا:''تم بالکل ویسی ہی ہو۔''

اسی نے خوشی سے کہا۔مکتا کی آنکھیں پل بھر کے لیے مسکرائیں اور پھر شانت اور

انجان ہوگئی۔ میں اپنی بیوی کوکل تجھ سے ملانے لگاؤں گا۔ہبن کی بات کرمکتا نے اینٹ کاٹکرااٹھاکراسے مارا۔ہبن کی پیشانی سےخون بہتا دیکھ کر ماں نے کہا:''یہ باؤلی ہوئی ہے۔ برامت ماننا۔اگلے دن سےمکتا نے کھانا پینا چھوڑ دیااوروہ مرگئی۔مکتا کی موت کے دن ماں بھی مرگئی۔مکتا کے مرنے پر ماں کودکھ نہیں ہوا۔اپنی بیٹی کا بوجھ اس نے کسی پرنہیں ڈالا۔کہانی کا سب سے بڑاالمیہ یہ ہے کہ امریا ریٹرنڈ ہبن اپنی آئی اور بیوی کی ضد پرانہیں پنڈھر پور جاترا پر لے کر جارہا ہے۔آئی گملے میں تلسی کا پودا اپنے سر پر اٹھائے شردھا سے منت کررہی ہے''ہے وٹھل پنڈورنگ! میری سون کی گود بھردے۔''ہری وٹھل، ہری وٹھل، ہری وٹھل کا جاپ کررہی ہے۔

''منت'' افسانہ عقیدت بھرا ایک مشہور افسانہ ہے۔اس افسانہ کو ہندی والوں نے بھی پسند کیا اوراردو والوں نے بھی۔ کچھ سطریں پڑھنے کے بعد قاری پورا افسانہ پڑھے بغیر نہیں رہتا:

> ''ممبئ سے پنڈھر پور جانے والے ٹولیاں لیزم بجاتی نرم سخت دھوپ میں سر پر پیٹھا باندھے کھڑی کی ڈنڈی میں وٹھل کی موتی کو لئے آگے بڑھتی چلی جارہی تھیں۔ پونا، بارامتی، اندا پور روڈ کے راستے سے یہ ٹولی شولہ پور روڈ چھوڑ کر پونے ضلع کے آخری گاؤں باوڑا سے آگے بڑھی۔ باوڑا میں ہون راؤ اپنی بہن مکتا اور ماں شانتا، جسے وہ آئی کہتے تھے، کو لئے ٹولی کے ساتھ ہولیا۔''22ے

اس اقتباس میں مہاراشٹرا کے ایک مشہور مقام پنڈھر پور کی یاترا کے ماحول کی

عکاسی کی گئی ہے۔ یہ منظرسال میں ایک بار جن گاؤں گاؤں کے نام صداقہ نے دیئے ہیں، وہاں میلے ٹھیلے کی طرح رہتا ہے۔ مہاراشٹرا ہی نہیں، سارے بھارت کے لوگ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں آتے اور اپنی مُرادیں پاتے ہیں۔ افسانہ مُکتا کے لیے اس سے آئی سے شروع ہوتا ہے اور بہن کی ماں کی اپنی بہو کی منت پر ختم ہوتا ہے۔ بیچ میں جو ماحول پیدا ہوتا ہے اور جن کرداروں سے کہانی بُنی ہوئی ہے، وہ افسانہ نگار صادقہ کے قلم کے جادو کا سماں باندھتی ہے۔''

افسانہ ''ٹی شرٹ'' میں نئی نسل کے جذبات واحساسات اوران کی سوچ وفکر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ افسانہ کی ابتداء ایک ایسے لڑکے کی ٹی شرٹ پر بنی تصویر سے ہوتی ہے جو اس کی ٹیچر نارہ کو بالکل پسند نہیں۔ کالج میں سالانہ تقریبات کی دھوم دھام چل رہی تھی اور پورا ایڈیٹوریم طلبہ اور مہمانوں سے بھرا ہوا تھا کہ اتنے میں ایک لڑکا نادرہ کو دکھائی دیا جو عجیب وغریب ٹی شرٹ پہنا ہوا تھا۔ نادرہ نے اُسے فوراً ٹوکا اور اُس نے بتانا چاہا کہ اس قسم کی تصویر والی ٹی شرٹ مہذب لڑکوں کے لیے مناسب نہیں لیکن طالب علم نہ تو ٹیچر کی باتوں سے متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی اُسے کچھ احساس ہوتا ہے بلکہ وہ ٹیچر سے کہتا ہے کہ یہ موجودہ عہد کا فیشن ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ صادقہ نواب سحر خود ایک استاد کی حیثیت رکھتی ہیں اور درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں اس لیے انہوں نے طلبہ وطالبات کے بدلتے ہوئے احساسات، جذبات اور نفسیات کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس کہانی میں انہوں نے کالج کے ماحول کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ افسانہ دراصل جدید عہد کے فیشن زدہ ماحول کی عکاسی کرتا ہے جہاں اخلاقی قدروں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

افسانہ ''نوٹس'' دراصل ایک کالج کی لڑکی کی زندگی کی ایک رخی روداد ہے جس کا نام مینا ہے ۔ وہ اپنے کالج کے پروفیسر ساہینی سے مل کر نوٹس مانگنا چاہتی ہے' اپنا تعارف کرواتی ہے ۔ پروفیسر کے پوچھنے پر اپنے گھر کے تمام حالات سے اس کو واقف کرواتی ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ اس کے والد نے دو شادیاں کر لی ہیں ۔ پہلی سی بھائی بہن ہیں اور سوتیلی ماں سے بھی کئی بچے ہیں ۔ اس افسانہ میں دراصل صادقہ نواب سحر نے شہری زندگی کے ماحول اور مزاج کی تصویر کشی بڑی فنکاری کے ساتھ کی ہے جہاں نا تو اخلاقی قدروں کا پاس ہے اور نہ عمر کا لحاظ ۔ مینا پریشان کن حالات سے گذرتی رہتی ہے ۔ کالج میں داخلہ لینے کے باوجود کالج میں وقت نہیں دے سکتی اس لیے کہ وہ کسی پرائیوٹ اسکول میں ملازمت کرتی ہے لہذا وہ اپنے پروفیسر سے نوٹس مانگتی ہے ۔ اس کہانی کی خصوصیت اس کا بیانیہ ہے اور واقعات کی جزئیات نگاری کو مصنفہ نے بڑے ہی پر کشش انداز میں پیش کیا ہے چوں کہ صادقہ نواب سحر خود ایک پروفیسر ہیں اور ان حالات سے بخوبی واقف ہیں ۔ اقتباس دیکھیئے :

> ''اس دن کالج میں فرینڈ شپ ڈے کی دھوم مچی تھی ۔ آرکسٹرا کا شور اور دھم مچاتے طلبہ......اسٹاف کو افتتاحی جلسے کے لیے کمیونٹی ہال جانا تھا اور دو دو جملے نیک خواہشات کے سنا کر فرینڈ شپ بینڈ بندھوا کر لوٹ آنا تھا ۔''
>
> ''اسٹاف روم میں طلباء کے بھیجے ہوئے سموسموں اور ٹی کپ کی چائی کا مزہ لے کر اسٹاف ادھر ادھر بکھر گیا ۔ کچھ کینٹن چلے گئے ۔ کچھ لائبریری' کچھ آفس اور اکا دکا چپکے سے نکل گئے ۔ تیز بارش کے ٹھنڈے ٹھنڈے سہانے موسم میں گھر جلدی

جا کر لحاف میں دبک کر ٹی وی دیکھنے کا مزہ کبھی کبھی ہی تو ملتا ہے۔ پروفیسر ساہنی کاریڈور میں کھڑی تیز بارش اور دودھیا جھرنوں کو نہار رہی تھیں کہ ایک نازک لڑکی نے پیچھے سے آواز دی۔''23ے

صادقہ نواب سحر اس افسانہ کے ذریعہ مجبور اور بے بس لڑکیوں کے مسائل پر سوال اٹھاتی ہیں جو پڑھنا تو چاہتے ہیں لیکن ان کے گھریلو حالات اور والدین اس میں دلچسپی لینے نہیں دیتے کیوں کہ ان کے اپنے مسائل اور حالات بھی انہیں مجبور و بے بس کر دیتے ہیں ۔ یہ مسئلہ اپنے ہی پیدا کیے ہوئے ہوتے ہیں ایسا اکثر چھوٹے قصبوں' گاؤں اور شہروں میں بھی ہوتا ہے اور خاص کر نچلے اور درمیانی طبقے کے لوگ کی لڑکیاں ان حالات سے دوچار ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ صادقہ نواب کا افسانہ ''نوٹس'' ایک اہم افسانہ ہے اور اس افسانہ کی کردار ''مینا'' اس افسانہ میں جان پیدا کر دیتی ہے۔ اقتباس دیکھیئے :

''کیا جاب کرتی ہو؟ پروفیسر ساہنی نے یوں ہی پوچھ لیا۔
''ٹیچر ہوں ۔ کشیلے کے آدرش ہائی اسکول میں انگلش میڈیم کی۔
''انگلش بولنی آتی ہے؟''
''تھوڑی تھوڑ' مگر لووَر کے جی' ہائر کے جی کو پڑھا لیتی ہوں۔
پوئٹری' کلر' پھل' پھول' گاڑیوں کے نام......'۔
کیا تنخواہ ہے؟............ایک ہزار روپیہ
پروفیسر کو انگلش میڈیم کے بچوں پر ترس آیا''۔24ے

اس افسانہ میں ماں کے ظلم کی ماری ایک لڑکی کی درد بھری داستان کو پیش کیا گیا ہے۔

اب تک کی جو مثالیں صادقہ نواب سحؔر کے افسانوں میں گاؤں کی منظر کشی، کردار اور مکالمہ نگاری کے دیئے گئے ہیں، وہ تو صرف کچھ مثالیں ہیں۔ ان افسانوں میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ گمبھیر مسئلوں پر بھی صادقہ نے لکھا ہے جن پر ہر ایک کی نظر پڑتی ہے لیکن ٹکتی نہیں۔ ٹکے گی تو ان پر غور و خوض ہوگا۔ غور و غوض ہوگا تو عمل کے راستے بھی پیدا ہوں گے۔ راستے پیدا ہوں گے تو ہمارے ہندوستانی سماج کی بُرائیاں دور ہوں گی۔ اگر ایسا ہوگا تو ہی ہمارے ملک کے عام آدمی کے اچھے دن آئیں گے۔ شاید یہی سوچ، یہی مقصد، یہی سپنا، افسانہ نگار صادقہ نواب سحر کا ہے۔ تبھی تو وہ سماج کو آئینہ دکھانے والے افسانے مسلسل لکھ رہی ہیں۔

افسانہ ''چاہے ان چاہے'' ایک سرکاری بینک ملازم پر مبنی کہانی ہے جس کا نام ریڈی ہے۔ اس افسانہ کا ہیرو بھی وہی ہے۔ وہ زندگی کے کئی نشیب و فراز سے گذر چکا ہے۔ وہ اپنے دوست رامیشور پر بے پناہ بھروسہ کرتا ہے اور اپنے دو دوستوں کو ضمانت دار بنا کر بینک سے قرض بھی دلا دیتا ہے۔ اس کے دونوں دوست ضمانت دار ریڈی کے پاس آتے ہیں کہ اب رامیشور نے قسط دینا بند کر دیا ہے اور کورٹ کی نوٹس آ پہنچی ہے اور اب ہم لوگوں کی سیلری بینک اکاؤنٹس میں بھیج دی جائے گی۔ ریڈی کو یہ لوگ یہ بتاتے ہیں کہ یہ سب کام اُسی کے کہنے پر ان لوگوں نے کیا تھا۔ ریڈی بہت پریشان ہو جاتا ہے، اُسے فکر ہو جاتی ہے کہ اب کیا کیا جائے، کافی سوچنے کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ والنٹری ریٹائرمنٹ لے لے گا اور ملنے والی رقم سے اپنے دوستوں کا

قرض چکھا دے گا۔ اس کے آفیسر نے اس کو بہت سمجھایا کہ تم والنٹر ی ریٹائر منٹ مت لو لیکن وہ اپنے آفیسر کی بات نہیں مانا اور دوستوں کا قرض چکھانے کے لیے والنٹر ی ریٹائر منٹ لے لیا۔ اس کے بعد اس نے ہو بلی میں ایک مکان کرایہ پر لے کر ہوٹل کھول لی۔ اس کی بیوی لتیکا نے اپنی کسی سہیلی کی جان پہچان کی ایک غریب عورت پاروتی کو کام کرنے کے لیے اپنے اس ہوٹل میں کام پر رکھ لیا تھا۔ آہستہ آہستہ ریڈی اور پاروتی میں دوستانہ تعلقات بڑھتے گئے۔ اچانک ایک دن ایک شخص صبح صبح ہوٹل میں آیا۔ وہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ رامیشور تھا۔ وہ ریڈی کے پاؤں پکڑ کر معافی چاہا اور اس نے بتایا کہ وہ سعودی عرب بھاگ گیا تھا اور اب وہ اس کا قرضہ سود کے ساتھ چکھانے آیا ہے۔ اُس نے روپئے کا بنڈل نکال کر ریڈی کے حوالے کر دیا۔ اس افسانہ میں کئی کردار ایک کے بعد ایک ہمارے سامنے آتے ہیں اور اپنا رول ادا کرتے ہوئے ہمیں بہت کچھ سبق دیتے ہیں۔ کہانی کی ابتداء میں قاری کی ملاقات رامیشور سے ہوتی ہے۔ اس کی محنت، لگن اور خلوص کو دیکھ کر قاری یہ سمجھتا ہے کہ یہ کردار اس کہانی کا مثالی کردار ہوگا لیکن جب دونوں ضمانت دار ریڈی کے پاس یہ فریاد لیکر آتے ہیں کہ اُس نے قسط دینا بند کر دیا ہے تو قاری کا رامیشور کی تیئں غم وغصہ آنے لگتا ہے مگر جب رامیشور نے سود کے ساتھ پیسہ چکھا دیا تو قاری کو رامیشور سے ہمدردی ہونے لگتی ہے اور قاری اس کی مجبوری کو سمجھ لیتا ہے۔ اس افسانہ کا دوسرا اہم کردار ریڈی ہے جو انسانیت، دوستی اور ہمدردی کا پیکر ہے جو دوسروں کی مدد کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ کہانی کا اختتام بڑا ہی معنی خیز ہے جو ریڈی اور پاروتی کی قربت اور ریڈی کی بیوی لتیکا کی سادگی پر ختم ہوتا ہے۔

افسانہ ''ہزاروں خواہشیں ایسی''، ممبئی کی گہما گہمی زندگی میں پلنے والے خاندان اوراسکی نئی نسل کوموضوع بنایا گیا ہے۔کہانی میں شمع، منی اوران کی ماں تین کردار ہیں۔ یہ خاندان نچلے طبقے کی نمائندگی تو کرتا ہے لیکن ان کے یہاں تعلیم بھی ہے اور دینداری بھی۔تینوں کی سوچ الگ الگ ہے۔شمع اور منّی امی جان کی بیٹیاں ہیں۔دونوں تعلیم یافتہ ہیں اور ماں کی باتوں پر عمل کرتی ہیں۔ماں نے شمع کا کارشتہ حارث صاحب کے بیٹے زید سے طے کرنا چاہا تو اس میں شمع کی رضامندی بھی چاہی۔شمع نے خاموشی اختیار کی جسے اس کی امی جان نے رضامندی سمجھا۔امی جان نے شمع کوشادی کے بعد اپنے شوہر کی اطاعت کے تمام گُر سکھائے۔رشتہ شمع کو پسند نہ تھا لیکن ماں کے سامنے وہ کچھ نہ کرسکی لیکن اس کی سوچ اسے بار بار کرب کے اظہار کے لیے اکسارہی تھی۔منی نے اس کے احساس کو سمجھا اور یہ بھی بتایا کہ آج بھی لڑکیوں کو آزادی نہیں، صرف آزادی کا لیبل پیشانی پر لگا کر پنجرے میں بند کردیا جاتا ہے۔منی کی باتوں سے وہ سو فیصد متفق تھی لیکن اسے یہ احساس بھی سائے جارہا تھا کہ اتنی کم عمر میں ایسے خیالات ننھی منّی کے ذہن میں کیسے پنپنے لگے اور وہ بھی اتنی پختگی کے ساتھ! کہانی کار نے شمع کے اس مشاہدے کے حوالے سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ نئی نسل اپنے طور پر سوچتی ہے۔اس کی بھی ہزاروں خواہشیں ہوتی ہیں۔کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے قاری شمع کی باتوں سے متفق ہوتا جاتا ہے۔منی کے دلائل قار کو متاثر کرتے ہیں۔مثلاً دیکھیئے یہ اقتباس:

''انسان نہیں ہوں؟''شمع نے ہنس ہنس کر بات ختم کرنی چاہی، مگر منی کی پیشانی پر ابھی لکیریں شانت نہیں ہوئی۔بولی:

''سوسال پہلے پیدا ہونا چاہئے تھا نہ تمہیں؟''
''ارے! کیا میں پرانا ماڈل لگتی ہوں؟'' شمع کو ہنسی آ گئی' سن کر بولی۔
''یا میرے خیالات تمہیں فرسودہ سے لگتے ہیں۔منی!''
''......سوسال پہلے پیدا ہوئی ہوتیں' تو تمہارے ذہن میں اس چیز کا تصور ہی نہ ہوتا......''
''کس بات کا تصور؟'' شمع نے بارہ برس کی اپنی منی سی دکھائی دینے والی پیاری سی بہن کی باتوں سے پریشان ہوکر پوچھا مگر منی آج بڑی سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کو بڑھائے جارہی تھی۔'' 25؎

تمام افسانہ میں ایک تعلیم یافتہ ماحول کی عکاسی توضرور ہے لیکن فنکارہ کی ہنرمندی نے کہانی کے کرداروں کواس کی فکر پرڈھال دیا ہے۔

اس افسانہ کے مطالعہ سے صادقہ نواب سحر یہ احساس دلانا چاہتی ہیں کہ انسانی زندگی اکیسویں صدی کی دہلیز پر پہنچ کر بھی عورت کے ساتھ سلوک روا رکھے جانے پر آمادہ ہے۔ابھی ہمارے سماج کا رویہ ردنہیں ہوا بلکہ عورت کی زندگی کا فیصلہ ہمیشہ اس کی مرضی کے خلاف ہوتے آیا ہے گویا صدیوں کی طرح آج بھی عورت وہیں پر کھڑی ہے جہاں وہ پہلے تھی۔اس اقتباس کو دیکھیئے :

''اخبار' رسالے' ٹی وی' کمپیوٹر' اسکول' کالج بکواس کرتے رہتے ہیں......گھر کی چہار دیواری میں پہنچ کر ہم صرف عورت ہیں نا......اور کچھ نہیں......محکوم' مظلوم......؟'' 26؎

صادقہ نواب سحر نے ایک عورت کی زبانی ان جملوں کا احساس دلا کر یہ بتانا چاہتی ہیں کہ ایک عورت کے درد اور احساس کو ایک عورت ادیبہ ہی درد اور کرب کے ساتھ محسوس کر سکتی ہے کیوں کہ یہ وہ جذبات ہیں جو صرف ایک عورت ہی محسوس کر سکتی ہے اور یہ ایک عورت کے بس کی ہی بات ہے۔ اس افسانہ میں گویا شمع کا کردار ہزاروں مظلوم لڑکیوں کے کردار کے روپ میں ابھر کر قاری کو جھنجھوڑتا ہے اور صنف نازک کی بے بسی کا بار بار احساس دلاتا ہے۔

''خدا کی دین بہت وسیع ہے'' اس افسانہ میں صادقہ نواب سحر نے دو ایسی خواتین کے درد کو بیان کیا ہے جو مرد ذات کی بے مروتی سے پیدا شدہ مسئلہ کا شکار ہیں۔ناہید اور ثمن دو ایسی خواتین ہیں جو مرد کی بے مروتی کا شکار ہیں ۔یہ افسانہ دراصل تانیثی رجحان کی ایک عمدہ مثال ہے۔اس افسانہ کا اہم کردار شیراز ہے جس کی توسط سے پورا افسانہ آگے بڑھتا ہے اور پھر شادی شدہ عورت کے مسائل کی عکاسی کئی نسوانی کرداروں کے ذریعہ ہوتی ہے۔شیراز ایک انجینئر ہے۔اچھے برے کی تمیز رکھتا ہے اور وہ گھر کے ماحول کو جہاں تک ہو سکے بگڑنے سے بچانے کی کوشش بھی کرتا ہے اس کی بیوی بدرالنساء جب دلہن بن کر گھر آتی ہے تو پیار و محبت سے رہتی ہے لیکن شیراز کی ماں بہن نے اسے اتنا ذہنی کرب دیا کہ شیراز بکھیر جاتا ہے لیکن اپنے دل کی بات زبان پر آنے نہیں دیتا بلکہ اپنی ماں بہن کی ہی طرفداری کرتا ہے اور بیوی کو ہی موردالزام ٹھہراتا ہے۔ایک دن جب وہ اپنی بیوی کے لیے ساڑی لیکر لوٹتا ہے تو یہ دیکھ کر سن رہ جاتا ہے کہ اس کی بیوی کا بدن نیل پڑ چکا تھا اور اسکی ماں اور بہن نے اسے زہر دیدیا تھا اور اس کی بیوی کا کردار یہیں ختم ہو جاتا ہے۔اب دوسرا کردار ناہید کی شکل

میں آتا ہے جواس کی دوسری بیوی ہے۔ وہ اس سے کس قدر خوش ہے اس کا بیان اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''اس واقعہ کو برسوں بیت چکے ہیں ۔آج ناہید میری بیوی ہے۔اس کا طمانیت سے بھرپور چہرہ' اس کا پرکشش جسم اس بات کا غماز ہیں کہ میں ہمیشہ ہی سے مسرت کے پھلوں سے اس کا دامن بھرا ہے۔اس کے دامن کے کانٹے میں نے چن لئے۔ناہید روح بن کر میرے جسم میں سما چکی ہے۔ہم دونوں بڑی محبت سے ایک چھوٹی سی کائنات آباد کی ہے' جس میں مہتاب بھی ہے' کہکشاں بھی ہے' آفتاب بھی اور شہاب بھی' مہتاب ہماری دھرتی کا چاند ہے کیوں کہ اس نے ہمیں پہلی بار ایک نئی تڑپ سے آشنا کروایا' ہمارے درمیان ایک نئے رشتے کو پروان چڑھایا۔''[27]

ناہید کے ساتھ اس کی زندگی نہایت ہی خوشگوار گذرتی ہے اور اس طرح یہ کردار بھی کہانی میں تھوڑی دیر کے لیے رک جاتی ہے اور پھر ایک تیسرا کردار سمن ماہتاب کا ابھرتا ہے جو شیراز اور ناہید کی بیٹی ہے ۔شیراز کے پاس سب کچھ ہے۔دولت ہے عزت ہے لیکن اس کی بیٹی کا طلاق ہو جاتا ہے۔شیراز چوں کہ باپ ہے وہ اپنی بیٹی کی دوسری شادی کے لیے پریشان ہے۔سمن مہتاب کی پہلی شادی ارشد نامی ایک شرابی آدمی سے ہو جاتا ہے جو اسے کافی اذیتیں پہنچاتا ہے جس کی وجہ سے طلاق ہو جاتی ہے اور اب دوسری شادی اظہر سے کی جاتی ہے۔ یہاں پھر سے مصنفہ نے وہی ساس و نند کے ظلم اور زیادتیوں کا شکار ہوتی ہوئی سمن کو بتایا ہے۔اب وہ اظہر سے بھی علحدہ ہو جاتی

ہے۔ یہ فیصلہ سمن نے خود کیا۔ اس کہانی میں افسانہ نگار نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ لڑکیاں جب بیاہ دی جاتی ہیں تو سسرال میں شوہر، ساس اور نندوں کے ظلم کا شکار ہوتی ہیں اور انہیں مختلف درد و دکھ سہنے پڑتے ہیں جس کی وجہ سے نوبت طلاق تک آ جاتی ہے اور پھر لڑکیاں یہاں سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ کوئی تعلیم کا سہارا لیتی ہیں تو کوئی کچھ ہنر سیکھ کر اپنے میکے والوں کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہیں اور ان پر بوجھ بھی بننا نہیں چاہتی۔ مصنفہ نے اس کردار کے ذریعہ لڑکیوں کو ایسے حالات میں پریشان ہونے کے بجائے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور اپنی تعلیم یا اپنی ہنرمندی سے اپنی زندگی خود سنوارنے کا سلیقہ سکھاتی نظر آتی ہیں۔ یہ کہانی تانیثی رجحان کی بہترین مثال ہے۔

افسانہ ''پہلی بیوی'' میں افسانہ نگار نے واحد متکلم بیانیہ کے ذریعہ اس کہانی کو بیان کیا ہے جب وہ کالج سے گھر کی طرف نکل پڑتی ہے تو راستے میں اسے دو ادھیڑ عمر کے جوڑے یوسف اور صابرہ ملتے ہیں جو اپنے نوزائیدہ بچہ کے علاج کے لیے اسپتال جا رہے ہیں اور علاج کے لیے تیس ہزار روپئے کا خرچ ہے جو یوسف کے پاس نہیں ہے۔ یوسف ایک غریب آدمی ہے۔ ردّی خریدنے کا کاروبار کرتا ہے۔ وہ واحد متکلم راوی فریدہ اس کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے ایک طالب علم کو فون کرتی ہے جو کسی سرکاری دواخانہ میں وارڈ بوائے ہے اور پھر ایک خط بھی اُسے دیتی ہے لیکن افسوس کہ اس بیمار بچہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ راوی فریدہ بہت بے چین ہوتی ہے۔ سوچتی ہیں کہ میت کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ وہ اپنے پرس سے پیسے نکال کر دینا چاہتی ہے اتنے میں ایک گھنگرالے بال والی عورت جو یوسف کی پہلی بیوی ہے اور صابرہ کی سوتن وہ اُسے منع کر دیتی ہے اور کہتی ہے کہ میں تمام اخراجات خود پورے کر دوں گی۔ اس پر

اس عورت کا جو جواب ہے وہی اس کہانی کا کلائمکس ہے۔اقتباس دیکھیئے :

’’میرے پاس میرے بچے کے کام کے لیے پیسہ ہے۔ یہ میرا حق ہے۔ میں تو اس کو اور میرے مرد کو بہت بولی تھی کہ میں خرچہ کرنے کو تیار ہوں‘ مجھے لڑکا دے دو۔ پھر میں اسے اسپتال لے چلتی ہوں لیکن اس نے ایک نہیں سنی‘ جیسے کہ بچہ بڑا ہوکر میرا ہی سہارا بننے والا تھا۔ گھنگھرالے بالوں والی عورت جب ایسا کہہ رہی تھی تب مجھے اس کے چہرے پر بڑی بیوی ہونے کا ٹھسہ دکھائی دیا۔

میں نے پرس سے پانچ سو روپئے کا نوٹ نکال کر صابرہ کے ہاتھ میں رکھنا چاہا۔تو وہ ایک دم کھڑی ہوگئی اور بولی۔

تم روپئے کیوں دے رہی وہ‘ وہ میرا ابھی تو بچہ تھا۔ وہ میری سوت ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو وہ وہ میرے مرد کی بیوی ہی۔ میرا مرد اسے چاہتا ہے۔کیا یہ کم ہے۔میرے پاس روپیہ ہے۔

میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی اور سست چال سے چلتی ہوئی گھر پہنچی دروازے پر کام والی بائی میرا انتظار کر رہی تھی ......‘‘ 28؎

اس کہانی کے ذریعہ صادقہ نواب سحر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت ہمدردی کا پیکر ہوتی ہے۔رشتے اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ عام طور پر سوتن کا رشتہ ایک دوسرے کے لیے جان لیوا ہوتا ہے لیکن اس کہانی میں صادقہ نواب سحر نے سوکن کا وہ روپ بتایا ہے جو ایک دوسرے پر سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار رہے اور یہی اس

کہانی کا کلائمکس ہے۔

افسانہ ''ایس ایم ایس'' موبائیل فون سے ہونے والی پریشانیوں پرمبنی افسانہ ہے۔آج ہر شخص کے ہاتھ میں موبائیل ہے۔کبھی کال کے ذریعہ کبھی ایس ایم ایس کے ذریعہ ایک دوسرے سے رابطہ کرنے میں ہرانسان مصروف ہے لیکن نتیجہ دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔یہی حال افسانہ کے کردار کرشنا کے ساتھ ہوا جسے کسی ایک لڑکی نے ایس ایم ایس کیا۔اس سے دوستی کرنی چاہئے اور ملاقات کیلئے جگہ اور وقت بھی مقرر کی لیکن جب کرشنا کو بلایا گیا۔اس وقت کرشنا کسی کام کی وجہ سے وہاں نہیں پہنچ سکا۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لڑکی اسے کئی بار فون کرتی رہی ۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ موبائیل کے غیر ضروری استعمال سے تعلیم پر برے اثرات پڑتے ہیں اور کبھی کبھی تو لڑکیاں اور لڑکے شرارتاً ایک دوسرے کو فون کر کے فون آف کر دیتے ہیں ۔تمام کہانی اسی پر مبنی ہے۔ کرشنا کہانی کے اختتام پر دیوانہ ہو جاتا ہے۔اقتباس دیکھیئے :

''اگر ایسا ہے......تو میں اسے اپنے کو یوز اینڈ تھرو کرنے نہیں دوں گا۔کیا میں استعمال کر کے پھینکنے کی چیز ہوں؟......مجھے تو ملنا ہے۔ملنا ہے' مطلب ملنا ہے۔اور مجھے اس سے ملنے میں تمہاری مدد چاہیے ۔کروگے!' ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی اور جبڑے تنے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔''29

افسانہ ''ایس ایم ایس'' میں ایک انجان محبت کو پیش کیا گیا ہے۔افسانہ نگار نے اس دور کے ٹکنالوجی کے استعمال اور اس کے ذریعے لوگوں کو کس طرح پریشان کیا جارہا

ہے' اس کو بہت ہی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔اس افسانے میں کرشنا اور اس کے دو دوست ممبئی شہر گھومنے کی غرض سے جاتے ہیں۔ وہاں کرشنا کے موبائیل پر ایک انجان نمبر سے مسیج آتا ہے۔کرشنا پریشان ہوجاتا ہے کہ یہ کون ہے۔ باتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے ملنے کی کئی بار خواہش ظاہر کرتے ہیں' لیکن کسی نہ کسی وجہ سے دونوں کی ملاقات نہیں ہو پاتی ۔آخر یہ راز' راز ہی رہ جاتا ہے کہ مسیج کرنے والا کون تھا یا کون تھی ۔افسانہ یہیں اختتام ہوجاتا ہے۔

الغرض صادقہ نواب سحر نے اپنے افسانوں میں اپنی فکر واحساس سے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے ۔ان کی کہانیوں میں سماجی' سیاسی' تہذیبی' ثقافتی' تاریخی' معاشی اور معاشرتی پہلوؤں کو بہتر طور پر نمایاں کیا جاتا ہے۔ان کے ہر افسانہ میں کوئی نیا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔ان کے زیادہ تر افسانوں کے پلاٹ سادہ اور کردار مثالی ہوتے ہیں ۔ وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے موضوعات کا انتخاب کرتی ہیں اور اسے اپنی افسانوی فکر میں ڈھال کر قاری کے سامنے پیش کرتی ہیں۔یہی ان کے افسانوں کے کامیابی کی روشن دلیل ہے۔

سلام بن رزاق صادقہ نواب سحر کی افسانہ نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اردو میں عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے بعد خواتین قلمکاروں میں بہت کم نام ملکی سطح پر اُبھر کر سامنے آئے ہیں ۔ صادقہ نواب کی کثیر الجہات صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کی ادبی روایت کو آگے بڑھانے والی خواتین قلمکاروں میں ایک

نمایاں کردار ادا کریں گی۔30؎

افسانہ ''ابارشن'' ایک شادی شدہ لڑکی کی تعلیم کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار ''سرینا'' کی ابھی جلدی ہی شادی ہوتی ہے کہ اس کے امتحان ہونے کو آجاتے ہیں۔ اس کے پہلے پرچے کے دن ہی امتحان ہال میں ''سرینا'' کو الٹی کی شکایت ہوتی ہے تو وہ باہر نکل جاتی ہے۔ بارہ اس کا شوہر موجود ہوتا ہے اور وہ اپنی بیوی کو سمجھاتا ہے کہ تم امتحان دے دو بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن وہ تیار نہیں ہوتی۔ اس پر شوہر اور بیوی میں بحث ہونے لگتی ہے:

> '' دے دو امتحان! ......ہو جائے گا......مجھے پتا ہے تم کرلوگی......کیوں گھبراتی ہو؟......میں ہوں نا!......''
> ''نہیں......مجھے چکر آتے ہیں......بار بار الٹی آتی ہے۔''
> ''سب ٹھیک ہو جائے گا......تھوڑا سا لکھ لو۔ پچاس میں سے اٹھارہ بھی مل جائیں تو چلے گا......فائنل اگزام میں گورا ہو جائے گا......تھوڑا سا لکھ لو۔''
> ''نہیں......نہیں......'' سرینا کی آواز کلاس کی پن ڈراپ خاموشی کو توڑنے لگی۔''31؎

شوہر کے لاکھ منانے پر بھی سرینا امتحان دینے کے لیے تیار نہیں ہوئی، جب کہ شوہر کا کہنا تھا کہ تم تھوڑا سا ہی لکھ کے آجاؤ جس سے تمہارا سال خراب نہ ہو اور تم اگلی کلاس میں پہنچ جاؤ۔ باوجود اس کے سرینا امتحان لکھنے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ سے اس کا شوہر ناراض ہو کر سرینا کو ہاتھ پکڑ کر لے جانے لگتا ہے اور کہتا ہے ''چل اسپتال، آج ہی تیرا ابارشن کرواتا ہوں............''

یہ کہانی عہد حاضر کے مسائل کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد معاشرتی زندگی کی افراتفری، انتشار اور عہد کے کرب سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ موصوفہ چونکہ درس وتدریس سے بھی وابستہ ہیں انہیں طلبا وطالبات کے جذبات، احساسات اور نفسیات کا بھی مشاہدہ کرنے کا موقع بہت قریب سے ملا ہے،لہذا انہوں نے اپنی کہانیوں میں کالج کی زندگی، ان کا استحصال اور پھر نوجوان نسل کی نفسیات، ان کے فکر ومزاج میں تبدیلی، فیشن زدہ ماحول اور اس معاملے میں کسی قسم کی مداخلت کا برداشت نہ کرنا جیسے موضوعات کو بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔

افسانہ ''باڈی'' اس افسانہ کا مجموعہ سب سے دردناک افسانہ''باڈی'' ہے۔اس افسانے کے ذریعہ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے سماج کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔انہوں نے اس افسانے کی منظر کشی بہت نپے تلے انداز میں مگر تفصیل سے کی ہے۔اس افسانے میں کسی لاش پر سرکاری اسپتال میں ہونے والی سیاست کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک زندگی ختم ہوگئی ہے،ایک انسان مرگیا ہے، ایک گھر تباہ ہوگیا ہے۔مگر پیشہ ور انسان اس لاش پر بھی پیسے کماتے ہیں۔

''کیا بزنس ہے نا لاش پیک کرنے کا!'' سیٹھ کے بڑبڑانے پر منڈل نے 'ہاں' میں سر ہلا دیا۔

''صاحب! ہم کو بھی پلین سے گاؤں بھیجو صاب!......نہیں تو ہمارے پہنچتے تک وہ لوگ بھائی کو دفنا دے گا''

''تو جا یار! ٹرین سے! اب تجھے بھیجنے پر ایک اور آٹھ ہزار

ڈالنا پڑے گا...... ایک تو دو ہزار روپئے پاٹل کو بھی دینے
پڑے ہیں۔''
''کیوں صاب؟''
''تب ہی تو باڈی ملی ہے......تم کیا سمجھوتے تھے!''
منڈل کی حیرت بھری آنکھوں کی جانب دیکھنے کی فرست کسے
تھی! سب کالی کانچ والی گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے' جو
رحیم کی لاش کو اسپتال سے انڈرٹیکر' پیکر کے یہاں لے جارہی
تھی۔32

صادقہ نواب سحر نے اس افسانہ میں انسانیت کی بے حسی کی بدترین مثال پیش کی ہے جہاں اعلیٰ اقداراورانسانیت نام کی کوئی چیزاب بچتی ہوئی نہیں دکھائی دیتی ہے۔

ایک دوسرے علاقے میں اسپتال میں مرے ہوئے انسان کو اس علاقہ میں آخری رسومات ادا کرنے کے واسطے لے جانے کے لیے کتنی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے' کہاں کہاں خانہ پُری کرنا پڑتا ہے' کتنے پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔مردہ خانہ سے پولیس تھانہ کا چکراور پھر وہاں سے پیک کر کے ڈیڈ باڈی کو اس کے علاقے میں لے جانے تک' ہر جگہ رشوت دینی پڑتی ہے۔

پیچ ندی کا مچھیرا : یہ صادقہ نواب سحر کا دوسرا تازہ افسانوی مجموعہ ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دلی سے 2018ء میں منظرعام پرآیا۔ یہ افسانوی مجموعہ 152 صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں کل 12 افسانے ہیں جس کی ترتیب اس طرح ہے۔ص 7' ص 13 سے لیکر 136 تک کے نام لکھنا ہے۔اس کے علاوہ ''سنئے تو سہی '' عنوان کے تحت انہوں نے اپنی بچپن کی یادوں اور ادبی ذوق وشوق کے علاوہ

تخلیقات کا بھی ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ آخر میں مصنفہ کا ایک مختصر سا خاکہ بھی موجود ہے۔جس میں ان کی اردو، ہندی، تلگو اور انگریزی زبانوں میں تراجم ہوئے تخلیقات اور نصاب میں موجود تخلیقات کے علاوہ انعامات واعزازات کی تفصیل درج کی گئی ہے۔

یہ افسانوی مجموعہ صادقہ نواب سحر کی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک اور اہم ادبی اضافہ ہے۔ اس مجموعہ کے افسانو ں میں سماجی اور عصری تقاضوں کو بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔صادقہ نواب سحر کا کمال فن یہی ہے کہ وہ اپنی تحریروں کو انسانی زندگی سے بہت قریب رکھتی ہیں۔سماجی، مذہبی، اخلاقی تعلیمی پہلوؤں کے علاوہ انسانی رشتوں کی پامالی اور خصوصاً نفسیاتی کشمکش کو اپنے کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ بہتر طور پر بیان کرتی ہیں۔

کیونکہ صادقہ نواب سحر نہ صرف ایک تخلیق کار ہے بلکہ پیشہ تدریس سے منسلک ہیں جس کی وجہ سے ان کی دوراندیش نظر میں طلبا و طالبات کے فکر و احساس اور ان کی زندگیوں کے مختلف پہلوؤں اور خاص کر گھریلو حالات کو بڑی فکرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ افسانہ ''سہمے کیوں ہو اُنکش!'' اس مجموعہ کا ایک اہم افسانہ ہے جو ماہنامہ ''آج کل'' نئی دہلی کے جون 2016ء کے شمارے میں شائع ہوا۔صادقہ نواب سحر نے اس افسانے کے ذریعے معاصر زندگی کے طلبہ و جبر اور زیادتیوں کو پیش کیا ہے جو زندگی کے تجربات اور بچپن کی یادوں میں بسی ہوئی ہوگئی ہیں۔اس کہانی میں انکش کا کردار اپنی نفسیات جذبات اور احساسات کے ساتھ بھرپور طریقے سے سامنے آتا ہے۔کہانی بالکل سیدھی سادھی بھی ہے اور واقعات بھی معمولی ہے جس کو صادقہ

نواب سحر نے اپنے کرداروں کے ذریعہ دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔افسانے کے آغاز سے ہی یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ افسانہ نفسیاتی کشمکش پر مبنی ہے:

> ''انکش نام کا انکش یعنی بندہ حسن تھا مگر اس پر کوئی بندھن عائد نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ایک لمحہ خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا اور پتہ نہیں وہ کیوں اتنی بے کلی کا شکار تھا! لیکن کل تو اس نے حد ہی کردی۔'' 33

دوپہر کے کھانے کے وقفہ میں نیرج نے اپنی پانی کی بوتل دے کر انکُش کو کہا تھا کہ میری بوتل میں پانی بھر کر لا ۔انکُش کو اپنے ساتھی کا یہ جارحانہ رویہ بالکل پسند نہیں تھا۔

اپنے ساتھی کے ساتھ زیادتی اور غیر ضروری زبردستی کا حکمانہ رویہ اب انتقام کی آگ میں تبدیل ہوجاتا ہے اور اب اُنکش روز بہ روز کی زیادتیوں سے تنگ آکر موقع ہاتھ آتے ہی پانی کی بوتل میں تھوڑا اپنا پیشاب ملا کر دیتا ہے۔ یہ باغی رویہ دراصل نیرج کی ناقابل برداشت دباؤ کا نتیجہ ہے۔ یہ کہانی مکالماتی انداز میں آگے بڑھتی ہے اور قاری کو حیران اور غصے کی کیفیت میں مبتلا کرتی ہے۔یعنی اُنکش دراصل نفسیاتی تناؤ کا شکار ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس طرح کی نازیبا حرکت کرنا جرم نہیں سمجھتا اور نہ ہی اس حرکت سے پیدا ہونے والے واقعات سے خوف زدہ ہوتا ہے بلکہ بدلہ لینا اس کا مقصد ہوجاتا ہے۔لیکن کلاس ٹیچر اُنکش کو سزا کے طور پر اس کی برہنہ تصویر تختہ سیاہ پر اتارنے کے لیے نیرج کو بلاتی ہے چھوٹے چھوٹے چاک کے ٹکڑوں سے اس کے کلاس کے تمام طلبا وطالبات تصویر کو مارتے جاتے ہیں جس پر انکُش دلبرداشتہ ہوجاتا

ہےاور ٹیچر کی اس حرکت پر وہ سہم جاتا ہے۔ٹیچر کہتی ہے۔

''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''وہ مجھے روز ستاتا ہے۔''

''اچھا!!اسی لیے تم نے یہ کیا! مجھ سے کیوں نہیں کہا؟''

''تو تم کو کھیلنے کے لیے وہی ملا!''

''وہ مجھے کسی اور کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتا!''

''اچھا! پھر تو وہ اچھا لڑکا ہے نا! تمہیں اکیلا ہونے نہیں دیتا۔ ساتھ رکھتا ہے۔''

''وہ مجھے اپنی پیٹھ کھجلانے کو بھی کہتا ہے۔''

''اسے کھجلی ہوتی ہوگی۔''

''کیا وہ تمہیں ہی اپنے کام کرنے کو کہتا ہے؟ دوسرے بچوں کو نہیں؟''

''پہلے دوسروں سے بھی کہتا تھا مگر اب مجھے ہی کہتا ہے۔ میرے پیچھے ہی پڑا رہتا ہے۔''

''کیوں کہ تم منع کرتے ہو۔ ہے نا!''

انکش ٹھٹکا پھر بولا''ہاں!''

پھر وہ بچوں سے مخاطب ہوئیں،بولیں،بچو! آپ کو پتہ ہے انکش نے ایک گندہ کام کیا ہے''۔

''آ آ آ آ......'' بچے چلائے۔

''بتاؤ اس کی سزا کیا ہونی چاہئے؟'' بچے چپی سادھے بیٹھے رہے''بولو بولو۔''سب چپ تھے۔

''اچھا! ایک کام کرتے ہیں۔ نیرج تم ادھر آؤ۔ تمہیں
ڈرائنگ اچھی آتی ہے نا! بلیک بورڈ پر ڈرائنگ بناؤ انکش
کی۔'' 34

ٹیچر کی تمام تر زیادتیوں کو ٹیچر نے بالکل نظر انداز کر دیا کیونکہ نیرج اُسی ٹیچر کا بیٹا ہے۔ اور یہاں ٹیچر نے ایک طالب علم کو اتنی بڑی غلطی کی صرف چھوٹی سی سزا ہی دی۔ اس واقعہ میں انکش زیادہ قصوروار نظر آتا ہے کیونکہ اس نے ابتداء ہی میں نیرج کی زیادتیوں کا ذکر کلاس ٹیچر سے یا پھر ہیڈ مسٹریس سے کیا ہوتا تو شاید نیرج کو سزا ملتی لیکن وہ چپ چاپ اس کی زیادتیوں کو ہستا رہا جس کی وجہ سے نفسیاتی کشمکش کا شکار ہو کر بہت بڑی غلطی کر بیٹھا۔ صادقہ نواب سحر یہاں طلبا و طالبات کو نصیحت کرتی نظر آتی ہیں کہ بچوں میں آپسی لڑائی جھگڑے جو بھی ہے وہ کلاس ٹیچر یا پھر اسکول کی ذمہ دار شخصیت کے سامنے ابتداء ہی میں آ جانا چاہیئے ورنہ آگے چل کر نتائج بڑے خطرناک ہو جاتے ہیں۔ دوسری اہم بات وہ بحیثیت تاکید کرتی ہیں کہ استاد کا کام ہے کہ دونوں بچوں وک سمجھائے اور نازیبا حرکت کرنے والے کو زیادہ سزا دیں۔ لیکن وہ یہاں اپنے بیٹے کے لیے بالکل نرم گوشہ رکھتی ہیں اور وہ قصوروار صرف انکش کو ٹھہراتی ہے جبکہ نیرج ٹیچر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے آئے دن اپنی کلاس کے تمام ساتھیوں کو کسی نہ کسی طرح راغب دیکھتا رہتا رہا ہے۔

اس افسانے کا ایک اہم اور سمجھدار کردار انکش کی ماں ہے جب ان تمام باتوں کی اطلاع ماں کو ملتی ہے تو ماں اپنے بیٹے کو ہی قصوروار ٹھہراتی ہیں اور اسے نصیحت کرتی ہے کہ اتنی بڑی غلطی نہیں کرنا چاہیے تھی تمہیں۔

''یس ٹیچر''

''انکش اور نیرج بھی اپنی بینچ پر لوٹ جائیں گے۔'' وہ سانس لے کر بولیں'' اور اپنی اپنی تاریخ کی کلاس ورک بُک نکالیں گے؟''

''یس ٹیچر......''

ٹیچر نے دروازے کی کنڈی کھولی۔ تبھی ہیڈ مسٹریس کلاس میں داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھ کر بچے اُٹھ کر ہو گئے۔ بولے'' گڈ مارننگ میڈم!''

ہیڈ مسٹریس نے بچوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بچے'' تھینک یو میڈم'' کہہ کر بیٹھ گئے۔ بچوں کو ایسی ہی تربیت دی گئی تھی۔

''میں نے سانا' اس کلاس کے بچے مکے بازی کی مشق کر رہے تھے!'' ہیڈ مسٹریس نے پوچھا۔

''جی میڈم۔'' کلاس ٹیچر بولیں'' انکش ہی کی شرارت ہے۔ '' اور ہیڈ مسٹریس کو انگریزی میں ان کی شرارت بتائی۔

''انکش! کم ہیئر۔' ہیڈ مسٹریس اسے اپنے آفس میں لے گئیں۔ اس کے ماں باپ کو فون کر کے بلا لیا اور اسے پندرہ دنوں کے لیے سسپنڈ کر دیا۔

دو دن گزر گئے۔'' تیرے کپڑے میلے ہو گئے ہیں۔ نہ نہا تا ہے نہ کپڑے بدلتا ہے'' ممی نے صوفے پر بیٹھے ہوا انکش کو ہلکی سی دھپ لگائی اور بولیں'' چپ چپ کر کیوں رہتا ہے...... بول تو کیا ہوا تھا؟'' وہ انکش کے شرٹ کے باقی بچے ہوئے

بٹن کھولنے لگیں، جنہیں میں اس نے فوراً دوبارہ لگالا۔ غصے کے باوجود ممی کو پریشان، سہمے سہمے انکش پر بے تحاشہ پیار آ گیا ۔ اسے بے چین دیکھ کرانہوں نے تڑپ کراسے اپنی طرف کھینچا اور سینے سے لگا لیا۔

''پندرہ دن کی پڑھائی......کلاس ورک، ہوم ورک، سب کیسے کور کروگے؟؟......بتا......بھلا کوئی ایسی شرارت بھی کرتا ہے ؟؟اچھا تونے اسے سزادی......تو......کوئی ایسی سزا......کیسے سوچ سکتا ہے تو؟؟'

'' وہ میرے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ میرے ڈبے سے مٹھائی نکال کر کھالیتا ہے۔اوپر سے وہ مجھ سے اپنے جوتے پہنانے کو کہتا ہے ہر روز پانی......'' آج انکش کھل کر بول رہا تھا، میں نے سزادی نیرج کو......''انکش نے سر اٹھا کر کہا۔

''پتہ ہے، تونے کتنی بڑی سزادی اس کو؟''

''ہوں''انکش نے دھیرے سے بند منہ سے جواب دیا۔

'' کیوں کیا تونے ایسا؟؟......غلطی ہوگئی نا تیری!......مجھ سے کہتا......ٹیچر سے کہتا......بول!''

''ہاں ممبئ!غلطی ہوگئی۔''

اچانک ممبئ کو کچھ خیال آیا۔ انکش کی بات کاٹ کر پوچھا'''انکش !......اچھا یہ بتا......مجھ تو پتہ نہیں، کیا تجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ نیرج تیری ٹیچر کا بیٹا ہے؟''

''پتہ ہے۔وہ تجھے ستاتا تھا میں نے اس کوسزادینے کے لیے

اس کی واٹر بوتل میں تھوڑا سوسو کر دیا۔‘‘

تھوڑا!!!...... بہت بڑا غلط کام ہوا ہے نا تجھ سے !‘‘ ممی نے

آنکھیں پھاڑیں۔

’’ہاں بہت غلط کام ہوا مجھ سے......مگر ممی انہوں نے مجھے ننگا

کر کے کیوں مارا؟‘‘ انکش نے اپنا چہرہ دوبارہ ماں کے آنچل

میں چھپالیا۔‘‘ 35؎

انکش کی ماں اپنی ممتا اور پیار کے ساتھ ساتھ اپنے بیٹے کو غلط کام کو غلط ہی بتا رہی ہے اور اسے نصیحت بھی کرتی ہے آئیندہ اس طرح کی نازیبا حرکت نہیں کرنا چاہیے کبھی کبھی اور وہ تو ہماری ٹیچر کا بیٹا، یعنی ماں بیٹے کو سمجھاتی ہے کہ انکش ٹیچر کا بیٹا ہے اس لیے اُس کی زیادتیوں اورصرف اپنے ساتھیوں پر جورعب ڈالتا ہے اسے نظرانداز کر دیا گیا۔

یہی اس کہانی کا کلائمکس ہے۔

صادقہ نواب سحر آئے دن تعلیمی اداروں میں ہوے والے آپسی تلخیوں کے خطرناک حالات سے نہ صرف پردہ اٹھایا ہے بلکہ ایک ٹیچر کا بیٹا اور ایک طالب علم اور ماں کے ذہنی رویہ کو بھی سامنے لایا ہے۔

مجموعی طور پر’’سہمے کیوں ہواُنکش !‘‘ ایک کامیاب نفسیاتی افسانہ ہے۔ جس میں کئی کرداروں کی ذہنی کیفیت کو ظاہر کیا ہے اور اپنے عہدوں کا خیال نہ رکھتے ہوئے اپنوں کے ساتھ اچھا سلوک اور دوسروں کے ساتھ غیر اخلاقی سلوک کو بھی منظرعام پر لایا ہے جبکہ انکش کی ماں اخلاق کا پیکر نظر آتی ہیں وہ اپنے بیٹے کی غلطی کو نہ صرف تسلیم

کرتی ہے بلکہ اسے نصیحت بھی کرتی ہے۔صادقہ نواب سحر نے ایک بہت ہی عام سے واقعہ کو اپنی فنکارانہ ہنرمندی سے ایک نصیحت آموز افسانہ بنادیا ہے۔اخلاقی پستی اور ذہنی کشمکش کو نمایاں کیا ہے۔

دیگرافسانوں وہیل چیئر پر بیٹھا شخص، راکھ سے بنی انگلیاں، ٹمٹماتے ہوئے دیئے شیشے کا دروازہ، پہاڑوں کے بادل، دیوار پر گیر پینٹنگ، اکنامکس، بیچ ندی کا مچھیرا، اُلّو کا پٹھا، ہوٹل کے کاؤنٹر پر، ٹوٹی شاخ کا پتہ وغیرہ شامل ہیں۔افسانہ''بیچ ندی کا مچھیرا'' ایک اہم کہانی ہے۔اس کہانی کا مرکزی کردار مہادیو کی جتنی اہمیت ہے بالکل اُسی طرح اس کی بیوی پدما کا کردار بھی اہم کردار ہے۔ پدما ایک ایسی عورت ہے جو ملازمت کرتی ہے اور ملازمت سے واپس ہونے کے بعد بنا کسی تھکن کے اپنے شرابی شوہر کے لیے لذیذ پکوان بھی تیار کرتی ہے۔اس کی توجہ ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنے شوہر کے علاوہ اپنے چار برس کے بیٹے کی تعلیم وتربیت پر بھی ہے۔وہ اتنی ساری ذمہ داریوں کے باوجود پریشان حال نظر نہیں آتی بلکہ پرسکون اور مطمئن نظر آتی ہے۔ یہ کہانی دراصل ممبئی کے اطراف بسنے والی بستیوں اوران میں مقیم غربت کا شکارافراد کی سماجی زندگی اور تعلیمی زندگی کا منظرنامہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک عورت کا اپنے گھر سنسار کو باوجود مشکلات کے بھکرنے سے سمٹ کر رکھنے کی بھرپورعکاسی کرتا ہوا بہترین افسانہ ہے۔اس کے علاوہ''ٹوٹی شاخ کا پتہ''اکنامکس اور''دیوار گیر پینٹنگ'' کہانیوں میں صادقہ نواب سحر نے صنف نازک کی ازدواجی زندگی کے مختلف مسائل اورنفسیاتی کشمکش کو بڑی ہنرمندی سے بیان کیا ہے۔ کہانیوں کے مطالعہ کے دوران ہرکہانی ایک منفرد درد وکرب سے بھری پڑی کہانی نظر آتی ہے۔غربت کا رنگ، حقوق

کی عدم دستیابی، خواتین کا استحصال وغیرہ یہ ایسے فکر انگیز مسائل ہیں جن پر صادقہ نواب سحر صدائے احتجاج بلند کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

بحیثیت مجموعی صادقہ نواب سحر دور حاضر کی ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سماجی، مذہبی اور تعلیمی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ صادقہ نواب سحر کے موضوعات پر غور کیا جائے تو وہ بالکل سیدھے سادھے اور معمولی سے عنوان کے ہوتے ہیں لیکن ان کی پیچیدگیاں نفسیاتی قسم کی ہوتی ہیں۔ ان موضوعات میں کہیں اسکول کا طالب علم نظر آتا ہے تو کہیں کوئی مظلوم عورت تو کہیں کسی کالج کی بے بس لڑکی جو خانگی ملازمت کرتے ہوئے اپنی تعلیم کو جاری رکھتی ہے تو کہیں بینک ملازم شخص اپنے دوستوں کو قرض دلا کر پریشان حال نظر آتا ہے۔ یہ سماج کی ایسی الجھنیں ہیں جس کی وجہ سے انسان نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ صادقہ نواب سحر چوں کہ پیشہ تدریس سے وابستہ ہیں جس کی وجہ سے ان کی نظریں طلبا اور طالبات کے ان پیچیدہ مسائل اور ان کی زندگیوں کے مختلف مسائل پر پڑتی ہے گویا ان کے افسانے عصر حاضر کے مسائل پر مبنی افسانے ہیں۔

حوالے

1۔ (سلیم شہزاد، اردو افسانہ، روایت اور مسائل ص:124)

2۔ (شمس الرحمٰن فاروقی، افسانہ کی حمایت میں، ص:87)

3۔ (بند کتاب: از: امیر النساء، ص:54)

4۔ (بند کتاب: از: امیر النساء، ص:65)

5۔ (بند کتاب: از: امیر النساء، ص:66)

6۔ (افسانہ منفرد، ص:35)

7۔ (افسانہ ڈسٹ بن، ص:14)

8۔ (افسانہ گہن، ص:34)

9۔ (نیا اردو افسانہ تجزیہ اور مباحث، ص:54)

10۔ (اردو افسانہ روایت اور مسائل، از: گوپی چند نارنگ، ص:134)

11۔ (افسانہ شریاں والی، ص:10)

12۔ (افسانہ شریاں والی، ص:12، 13)

13۔ (افسانہ شریاں والی، ص:13)

14۔ (افسانہ شریاں والی، ص:17)

15۔ (افسانہ شریاں والی، ص:19)

16۔ (افسانہ میٹر گرتا ہے، ص:25-24)

17۔ (افسانہ میٹر گرتا ہے' ص:23)

18۔ (افسانہ میٹر گرتا ہے' ص:25)

19۔ (افسانہ شرارہ' ص:21)

20۔ (خلش بے نام سی' صفحہ نمبر:36'37)

21۔ (افسانہ سلگتی راکھ' ص:50)

22۔ (افسانہ ''منت'' ص:51)

23۔ (''میڈم مجھے نوٹس ملیں گی؟'' (ص:65)

24۔ (افسانہ ''نوٹس'' ص:66)

25۔ (افسانہ ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' ص:92)

26۔ (افسانہ ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' ص:92)

27۔ (''خدا کی دین بہت وسیع ہے'' ص:95)

28۔ (افسانہ ''پہلی بیوی'' ص:117)

29۔ (افسانہ ''ایس ایم ایس'' ص:127)

30۔ (سلام بن رزّاق' پشت پیچ۔ کہانی کوئی سناؤ متاشا' از ڈاکٹر صادقہ نواب سحر)

31۔ (افسانہ ''ابارشن'' ص:130)

32۔ (افسانہ باڈی' ص:144)

33۔ (افسانہ سہمے کیوں ہو انکُش' ص:13)

34۔ (افسانہ ''سہمے کیوں ہو انکُش'' ص:14,15)

35۔ (افسانہ ''سہمے کیوں ہو انکُش'' ص:18,19)

باب چہارم

صادقہ نواب سحر کی ڈراما نگاری:

صادقہ نواب سحر دور حاضر کی ایک اہم فکشن نگار ہیں۔ 2012ء میں ان کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ'' مکھٹوں کے درمیان'' منظرعام پرآیا۔ اس مجموعہ میں 10 ڈرامے شامل ہیں جومندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ہیں۔

1۔دیا جلے ساری رات'2۔ظلم تو ظلم ہے'3۔اور گھنگرو بجتے رہے'4۔ڈاکٹر کفن پھاڑ'5۔تین دو پانچ '6۔میرج بیورو' 7۔ڈسکو کالج ممبئی'8۔سلطان محمود غزنوی' 9۔باادب باملاحظہ ہوشیار'10۔خودکشی یاموت (انجام ہمیں معلوم نہ تھا)

صادقہ نواب سحر کی ڈراما نگاری کے بارے میں ڈاکٹر شہناز صحابائی لکھتی ہیں:

> '' یہ تمام ڈرامے سماجی ونفسیاتی مسائل کے آئینہ دار ہیں جو کہ ڈراما نگار کی حساس طبعیت کومنشکف کرتے ہیں۔وہ انسانیت میں یقین رکھتی ہیں۔قلم کے ذریعہ عوامی خدمت کاحق ادا کرنا چاہتی ہیں ۔عورت کی مظلومیت' مرد کا شراب نوشی کر کے پورے خاندان کو زندہ درگور کردینا' بچوں کے ارمان اور مایوسیاں' یہی وہ موضوعات ہیں جوان کے ڈراموں کے محرک ہیں''۔1ے

اس مجموعے میں موجود ڈراموں کے کردار یقیناً ہمارے اردگرد کے ہی کردار ہیں جو اپنی زندگی کی جدوجہد میں مصروف ہیں ۔ڈرامے پڑھتے وقت قاری مکمل طور پرفکرواحساس کے مطالعہ میں محو ہوجاتا ہے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کے

ڈراموں میں عصر حاضر کے تقاضوں اور مسائل کی ترجمانی نظر آتی ہیں۔انہوں نے کسی ایک خاص موضوع کے تحت ڈرامے نہیں لکھے بلکہ مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔تمام ڈرامے فنی اور تکنیکی اعتبار سے کامیاب ہیں۔مجموعہ کا پہلا ڈراما ''دیا جلے ساری رات'' ایک نفسیاتی ڈراما ہے جس میں انہوں نے اولاد کی نافرمانی کو موضوع بنایا ہے وہیں دولت کے لالچی افراد کے خلاف ایک بھرپور آواز اٹھائی ہے۔

''دیا جلے ساری رات'' تین بابی طبع زاد ڈراما ہے جو ممبئی کے مصروف ترین ماحول کو بیان کرتا ہے جہاں آئے دن نہ صرف ہندوستان سے بلکہ کئی بیرون مما لک سے لوگ روزگار کی تلاش اور فلمی دنیا میں قسمت آزمانے آتے رہتے ہیں۔اور کس طرح اُن میں سے کچھ نوجوان مجبوریوں کے باعث ناکامیوں کا شکار ہو کر جرم و جبر حریص وہوس کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔

اس ڈرامے کے تین اہم کردار ہیں (۱) بابو بھائی جو ایک لڑکی نوری کے والد کا کردار ہے (۲) نوری ناز ونخروں میں پلی بابو بھائی کی اکلوتی بیٹی ہے جیسے دولت پر فخر جس کی وجہ کسی کو وہ خاطر میں نہیں لاتی۔(۳) باشاہ ایک نوجوان ہے جو تلنگانہ کے ضلع بھونگیر سے تعلق رکھتا ہے لیکن روزگار کی تلاش میں ایک دن اپنی سوتیلی ماں کی شکایتوں سے باز آکر ممبئی کیلئے ٹرین میں بیٹھ کر روزانہ ہو جاتا ہے۔ٹرین میں ایک بدمعاش کے ہاتھوں لگ جاتا ہے۔اقتباس دیکھیئے:

''اُچکے کی آواز : کیا ہے......کیا نام ہے تیرا؟ چل بول نا فٹافٹ......

باشاہ : باشا!

اچکے کی آوز : کدھر سے آیا ہے؟

باشا : بھون گری سے

اچکے کی آواز : وہ کدھر ہے بولے تو؟

باشا : حیدرآباد کے پاس ہے

اچکے کی آواز ابھی کدھر جانے کا ہے؟

باشا : ......

اچکے کی آواز : پکچر میں کام کرنے آیا کیا؟

باشا : تم کو کیسے پتہ؟

اچکے کی آواز : اپن بھی ایک ایکٹر ڈھونڈ رئیلا ہے۔ پیسہ کتنا لایا ہے؟ سب نکال...... چل بول نا بے فٹا فٹ۔

باشا : ہاں......ہاں......

اچکے : پیسہ نئیں ہے تو پھر پیسہ کمانا پڑے گا۔ کما کے پیسے بھرے گا تو بول ملے گا۔

باشا : ارے ایکٹنگ کرنے والوں کو تو بھوت پیسہ ملتا ہے۔ تم ہم سے مانگتے ہو؟

اچکے کی آواز : پہلے دینا پڑتا ہے بعد میں لینا پڑتا ہے۔

باشا : اوہ......(پوٹلی کھول کر ٹٹولتا ہے۔)

اچکے : تو پیسہ نکال۔ میں دو منٹ میں بیڑی لے کر آتا ہوں تو بھی پیئے گا نا؟

باشا : نئیں۔

اچکے : دومنٹ اِدھر رُک جا۔ تیرے کو دھندے پر لگاتا ہے۔ اچھا ہوا اپن تیرے کو مل گیا۔ نئیں تو معلوم نہیں تیرے کو کون ٹھکانے لگا دیتا۔

اچکے : ٹھکانے؟ (پولیس کی سیٹی کی آواز آتی ہے۔)

اچکے : اچھا ٹھہر......میرا ہاتھ پکڑ لے......میں بعد میں بیڑی پئے گا۔تو بعد میں پوٹلی کھولنا۔دیکھ پولیس آیا ہے۔بولنے کا میں تیرا باپ؟

باشا : نہیں تم میرے میرے باپ نہیں ہو۔

(سر پر مارنے کی آواز کے ساتھ۔باشا کی مار کھانے کی ایکٹنگ)

اچکے : پھر وہ تیرے کو پکڑ کر جیل میں ڈال دے گا۔

(سیٹی کی آواز کے ساتھ بابو بھائی کی آواز)2ؔ

اسی دوران ٹرین کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے بابو بھائی ایک مسافر ہے جو کسی طرح باشا کو اُس بدمعاش کے چنگل سے بچانا چاہتے ہیں۔اچانک ٹرین میں پولیس کی سٹی کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔لڑکا باشا گھبرا جاتا ہے اور وہ بعدمعاش بھاگ جاتا ہے۔بابو بھائی بچے کو اپنے پاس بیٹھا لیتے ہیں۔اقتباس دیکھیئے :

''بابو بھائی کی آواز: آجا بیٹا ڈر مت میرے گلے لگ جا

(پس منظر کی پلیٹ فارم کی آوازیں رُک جاتی ہیں)

باشاہ : یہ کون تھا چاچا؟اس نے مجھے سر پر کیوں مارا؟

بابو : چاچا نہیں بابا تو بچ گیا۔ایک مار میں زندگی بچ گئی ورنہ تجھ سے بھی چرس گانجے کا دھندا کرواتا تجھے بھی اپنے جیسا بنالیتا۔''3ؔ

تو نصیب والا ہے کہ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سب کچھ سن رہا تھا۔ممبئی میں جو اس طرح سے آتا ہے اس کی زندگی اکثر موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔

باشا : مگر فلموں میں

بابو بھائی : چھوڑ یار فلمیں۔اپنا اتنا اچھا خاصا کاروبار ہے۔کچرا بھنگار کا رہنے کو چھت' پہننے کو کپڑا اور پیٹ بھر کھانا ملے گا۔

باشا : (جلدی سے) ہاں چلوں گا۔آپ مجھے اپنے ساتھ لے جایئے۔

بابا آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔4؎

ڈرامے میں باشا کا کردار ڈراما نگار نے دراصل ممبئی کے ماحول اور وہاں کے جرائم کو خاص طور سے ملحوظ رکھا ہے کہ کس طرح ممبئی کی بھاگ دوڑ اور وقت جیسے سانسوں سے بھی تیز چلنے والے شہر میں خاص کر نوجوانوں ممبئی کا رُخ محض روزی روٹی کی تلاش میں کرنا اورانہیں وہاں کے حالات کا شکار ہونا پڑتا ہے اُن کا ذکر بڑی چابکدستی سے صادقہ نواب سحر نے اپنے ڈراماں میں پیش کیا ہے۔

نوجوان باشا پرتو بابو بھائی کی کرم فرمائی ہوئی کہ اُسے وہ اپنے گھر لے گئے۔دووقت کی روٹی دی اورکام پرلگا دیا۔

باشا میں بھی ایمانداری اورمحنت بے پناہ موجودتھی۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے وہ اپنا داماد بنانے کے لیے بھی تیار ہوگئے۔دراصل نوری کی منگنی بچپن میں اس کے پھپھی زاد بھائی وسیم سے طئے ہوجاتی ہےاور جب شادی کے دن پتہ چلتا ہے کہ بابو بھائی یعنی نوری کے والد نے زمین جائیداد صرف نوری کے نام ہی کیا ہےاورداماد کے نام کچھ نہیں۔جب وسیم کی ماں جو بابو بھائی کی حقیقی بہن ہےانہیں پتہ چلتا ہےتو وہ نوری کو بہو بنانے سے انکارکردیتی ہے اُس کی نظریں صرف اپنے بھائی کی دولت پر ہیں' یہاں صادقہ نواب سحر نے بڑی فنکاری کے ساتھ یہ بتانا چاہا کہ آج کل خاص رشتوں کوبھی صرف دولت کے ترازو میں تولا جارہا ہےاورایک لڑکی کوجواپنے بھائی کی ہی بیٹی ہے خاص پھوپھی دولت وجائیداد میں صرف اپنے بیٹے کا نام نہ ہونے کی وجہ سے اپنے بیٹے

کی بارات واپس لیکر لوٹ جاتی ہے اور اُن کی لالچی ذہنیت سامنے آتی ہے۔شادی کی خوشیوں کے بجائے وہاں ایک ہنگامہ برپا ہوجاتا ہے۔نوری کے والد بابو بھائی اس کا بے حد صدمے لیتے ہیں اور سماج میں اپنی اور بیٹی کی عزت بچانے اپنے گھر لائے نوجوان جو کافی سالوں سے اُن کے گھر کا ملازم ہے۔یعنی باشا سے اپنی بیٹی کا نکاح طئے کر دیتے ہیں ۔نوری اپنے گھر کے ملازم کو ہی اپنے شوہر کے طور پر قبول کرنے کس طرح راضی نہیں ہے لیکن باوجود اُس کے بابو بھائی نکاح کروادیتے ہیں۔اب نوری کا دل ودماغ الجھنوں کا شکار ہوجاتا ہے اور وہ ہر ایک سے الجھنے لگ جاتی ہے اور ہمیشہ باشا سے نفرت کرتی رہتی ہیں اور موقع پا کر باشاہ سے چھٹکارا حاصل کر کے گھر سے چلی جاتی ہے۔اور بدمعاش لوگوں کے ہاتھ لگ جاتی ہے ادھر باشاہ بھی مایوس ہوکر اپنے گاؤں کی ایک لڑکی طاہرہ سے شادی کر لیتا ہے اور صاحب اولاد بھی ہوجاتا ہے۔نوری ایک وقت کے بعد اپنے کیئے پر شرمندہ ضرور ہوتی ہے۔ اس ڈرامے کے بارے میں ڈاکٹر شہناز صبیح لکھتی ہیں:

> ''نوری نازنخروں میں پلی ہوئی دوشیزہ ہے۔نوری کی شادی اپنے پھوپھی زاد وسیم سے بچپن سے طئے ہے لیکن شادی کے وقت جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جائیداد بیٹی کے نام ہے داماد کے نہیں تنازعہ ہوتا ہے اب نوری کے والد بابو بھائی کو علم ہوتا ہے کہ شادی صرف جائیداد کے لالچ میں کی جارہی ہے تو وہ شادی سے انکار کر دیتے ہیں بارات لوٹ جاتی ہے۔ باشاہ کی خوبیوں سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔اس کا نکاح نوری سے کر دیتے ہیں۔نوری گھر کے نوکر کو شوہر کی شکل میں کس

> طرح ذہنی طور پر قبول نہیں کر پاتی ہے۔ اسی نفسیاتی گتھی کو مرکوزیت دی گئی ہے اور یہی پیغام ڈراما نگار دینا چاہتی ہیں کہ قوم کی دوشیزاؤں کو والدین اور اُن کے فیصلوں کا احترام کرتے ہوئے اپنی تقدیر پر شاکر رہ حالات کا مقابلہ کرنا چاہیئے والدین اولاد کے دشمن نہیں ہوا کرتے ان کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔فرار کسی مسئلہ کا حل نہیں ہوتا ہے۔5

اس ڈرامے کے ذریعہ صادقہ نواب سحر یہ بتانا چاہتی ہیں کہ حالات سے فرار حاصل کرنا اور ماں باپ کی بات کونہیں ماننا زندگی میں اور زیادہ پریشانیاں میں مبتلا ہونا ہے۔ کیوں کہ والدین کی بھی اپنی ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور اپنے بچوں کے حق میں اُن سے بہتر کوئی اور نہیں سوچتا لہذا بچوں کو بھی اپنے والدین کے فیصلوں کی قدر کرنی چاہیئے۔

ڈراما سلطان محمود غزنوی

ڈراما ''سلطان محمود غزنوی'' کے مرکزی کردار صرف دو ہی ہیں ۔محمود غزنوی اور ان کا وزیر دیگر کردار ضمنی کردار ہیں' بہر حال تمام کردار تاریخی حوالے سے حقیقی کردار ہیں ۔تہذیبی و تاریخی' سیاسی اور معاشرتی ڈرامے جو تاریخی پس منظر یا حوالے سے لکھے جاتے ہیں ان میں کردار نگاری' تاریخی مآخذ اور تخلیقی توانائی کے فنی امتزاج کے ساتھ ہوتی ہے تو کردار بھی بہت اہمیت کے حامل ہو جاتے ہیں ۔

صادقہ نواب سحر کا ڈراما ''سلطان محمود غزنوی'' تاریخی مآخذ اور تخلیقی برتاؤ کا موثر امتزاج کہا جا سکتا ہے ۔ انہوں نے مکالموں کے وسیلے سے بیک وقت بادشاہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے' مثلاً بادشاہ کا حلیہ' انداز فکر' ذہانت' محسوسات اور خود شناسی اس کے محاذی کا لہجہ اور وزیر کا لب ولہجہ وغیرہ ۔

ڈراما ''سلطان محمود غزنوی'' صدیوں قدیم ایرانی بادشاہوں کی معاشرتی' تہذیبی اور سیاسی روایتوں کا فنکارانہ مرقع ہے ۔عصر حاضر کے تناظر میں ڈراما اور کردار نگاری کی بہ نسبت صدیوں قدیم ان دیکھے حالات اور کرداروں کی لفظوں میں تصویریں اتارنا آسان بات نہیں ہوتی ۔'' سلطان محمود غزنوی'' ایک بابی ڈراما ہے جو پہلے منظر سے شروع ہو کر چوتھے منظر پر ختم ہوتا ہے ۔ بادشاہ اور وزیر کے علاوہ ضمنی کرداروں میں بادشاہ کا بھانجہ فریادی (ایک مظلوم شخص)' ایک بڑھیا' سپاہی اور درباری منظر کا حصہ

ہیں۔اس ڈرامے کا خارجی پہلو یہ ہے کہ چار منظروں میں تین روایتوں کا بیان ہے۔ پہلے منظر میں بادشاہ محمود غزنوی اوراس کا وزیر آپس میں بات چیت کررہے ہیں۔وزیر محمود غزنوی کے چہرے کواپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کہتا ہے اور محمود اسے وزیر کی خوشامد باور کرتے ہوئے کہتا ہے بادشاہ ہوکربھی میرا چہرہ بادشاہوں جیسا نہیں ہے میرا چیچک زدہ چہرہ دیکھ کرکون خوش ہوسکتا ہے۔اس گفتگو کا اختتام وزیر کی بے پناہ فراست اور بادشاہ کے تسکین قلب پر ہوتا ہے۔یہی اس منظر کا نقطہ عروج ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

محمود: الحمداللہ!محترم میں یہی کہنا چاہتا تھا'امیر قد'فوی الجتہ' جسم'چیچک کے داغوں سے داغدار ہے بے رونق چہرہ بادشاہوں کا چہرہ درمیان دیکھنے سے آنکھوں کی روشنی بڑھتی ہے لیکن میرا معاملہ توالٹا ہے یقیناً میری شکل دیکھ کر لوگوں کوکوفت ہوتی ہوگی۔یہ چہرہ' یہ شخصیت اور یہ شاہانہ سجاوٹ......۔

> وزیر: سلطان کا اقبال بلند ہو' آپ کی شکل تو چند ہی دیکھ پاتے ہیں۔لیکن سیرت اور خصلت سے ساری دنیا کو فائدہ پہنچتا ہے...... پسندیدہ خصلتیں اور نیک عادتیں اختیار فرمائیے' اپنی صورت سے درگزر کیجئے۔اس طرح رعایا میں آپ کی محبت بڑھے گی' ان کے دل ودماغ آپ کی محبت اور رعایا پروری کے خیال سے روشن رہیں گے۔'' 6

وزیر کے حکیمانہ الفاظ محمود غزنوی کی ذہنی تربیت کے محرک بن جاتے ہیں ساتھ ہی بادشاہ محمود کو بے چینی و بے قراری اور مایوسی سے نجات مل جاتی ہے۔تاریخ نگاروں

نے محمود غزنوی کو ظالم، وحشی اور درندہ صفت بادشاہ بتایا ہے۔صادقہ نواب سحؔر نے تاریخی ادراک کے حوالے سے گویا محمود غزنوی کے چہرے سے تاریخ نگاروں کو اچھالا گیا کیچڑ صاف کر دیا ہے۔ اس طرح ایک ڈرامہ نگار صحت مند تاریخی حقائق کے انکشاف کا موجب بھی ہوا ہے۔اس ڈرامے کے پہلے منظر کے نقطہ عروج سے ایک اور نکتے کا انکشاف ہوتا ہے۔ملک ایران کے مسلمان بادشاہ جس قدر بہادر ہوا کرتے تھے، اتنے ذہین، مہذب، حق پسند بھی تھے اور اپنے مشیر نما وزیروں کے مشوروں پر عمل بھی کرتے تھے۔سنجیدگی، اور ذہانت کے ساتھ سوچتے بھی تھے۔ وہ مشورہ چاہے شاہی مزاج اور رویوں کے منافق ہی کیوں نہ ہوں۔

ڈرامہ ''سلطان محمود غزنوی'' کے دوسرے منظرے کے دو حصے ہیں۔ الف اور بے۔اس منظر کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ کے دربار میں ایک فریادی حاضر ہوتا ہے اور شکایت کرتا ہے کہ شاہی خاندان کے ذی اثر شخص نے اس کے گھر میں گھس کر اسے گھر سے باہر کر دیا اور اس کی بیوی کو اپنے قبضے میں لے لیا اور ایسا پندرہ دنوں سے برابر ہو رہا ہے۔ بادشاہ کے پوچھنے پر فریادی بتاتا ہے کہ اس پر ظلم ڈھانے والا ذی اثر شخص بادشاہ کا بھانجہ ہے۔رات کو سلطان محمود غزنوی فریادی کے گھر پہنچتا ہے اور فریادی کے ہاتھوں دیا گُل کروا کے اپنے بھانجے کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔اقتباس:

'' محمود : فریادی! شمع جلا دو۔

فریادی : سلطان کا انصاف تا قیامت زندہ رہے۔

محمود : جلدی سے تھوڑا پانی پلا دو بہت پیاسا ہوں۔

فریادی : سلطان آدھی رات کو آپ کے آرام میں مخل ہوا۔

محمود : بادشاہ کی زندگی، چین و آرام رعایا کے لیے وقف ہوتے ہیں۔

فریادی : مکان میں آتے ہی آپ نے شمع کیوں گل کروادی اور اندھیرے میں قتل کر کے پانی کیوں پیا۔

سلطان محمود : شمع گل کی بھانجے کی صورت دیکھ کر دل پگھل نہ جائے اور پانی اس لیے پیا کہ جب سے تمہاری فریاد سنی تھی۔ ظالم کو سزا دینے تک کھانا پینا اپنے اور حرام کر لینے کی قسم کھائی تھی۔ تین دن سے کچھ کھایا نہ پایا۔ اب تمہارا انصاف پورا ہو چکا تو پیاس کا شدید احساس بھی ہوا''۔7

سب سے پہلے منظر کے نقطہ عروج پر سلطان محمود غزنوی کے مستحکم انصاف پسند کردار کا انکشاف ہوتا ہے۔ انصاف کرنے میں عجلت اور منصفانہ اقدام کے پہلے خود پر کھانا پینا حرام کر لینا منصفانہ کردار کی عظمت کی علامت ہے۔ اب تیسرے منظر کے محاسن ملاحظہ کریں۔ اس تیسرے منظر کے حوالے سے سلطان محمود غزنوی کی شخصیت کا ایک اور روشن پہلو سامنے آتا ہے کہ حق و انسانی مساوات پر سلطان محمود غزنوی امتیازات نہیں رکھتا تھا بلکہ انصاف کے معاملے میں اصول پسند تھا۔

تیسرا منظر اس طرح ہے کہ بادشاہ کے دربار میں ایک ضعیف خاتون فریاد لے کر آتی ہے کہ غزنی سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر ڈاکوؤں نے اس کے بیٹے کو قتل

کر کے سارا مال واسباب لوٹ لیا۔ میں بے یارومددگار ہوگئی ہوں۔ میری مالی اعانت اور ڈاکوؤں کو سزا دی جائے۔فریاد کے جواب میں بادشاہ اور خاتون کے مابین جو مکالمہ ہوا' ملاحظہ کریں:

بڑھیا : ''جہاں پناہ! فریاد! قافلہ جارہا تھا اچانک ڈاکوؤں نے اس پر حملہ کیا۔ مال لوٹ لیا اور میرے بیٹے کو مار ڈالا۔

سلطان محمود : قافلہ میں کون کون تھا۔

بڑھیا : میں اور میرا بیٹا تجارت کی غرض سے تاجروں کے ایک قافلے میں شامل ہوگئے۔ بیچ میں مال واسباب سے لدے اونٹوں کی لمبی قطار تھی اور سب محافظ اطراف میں تھے۔

سلطان محمود : (خاتون سے) اے نیک بی بی جس علاقے میں تم نے اپنے قافلے کا لٹنا بیان کیا ہے' وہ جگہ تو غزنی سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر ہے۔ میں اتنے فاصلے پر نہ ڈاکوؤں کی سرکوبی کر سکتا ہوں اور نہ راستوں کو محفوظ رکھ سکتا ہوں۔

بڑھیا : پھر آپ ایسے ملک کو فتح ہی کیوں کرتے ہیں جن کا انتظام نہیں کر سکتے۔ اللہ مرنے کے بعد آپ سے ایسے ملکوں کی بدانتظامی کے بارے میں ضرور سوال کرے گا۔

محمود : (ہنستے ہوئے پیسوں کی تھیلی بڑھیا کو دیتے ہوئے): نیک بی بی! تمہارے جواب نے دل خوش کر دیا اور دماغ روشن! شکر خدا کہ سلطان محمود سے عوام خوف زدہ نہیں ہے اور بے خوف ہو کر اسے دنیا و دنیا کا سبق دے سکتی ہے۔

محمود : (وزیر سے): قبلہ ڈاکوؤں نے واقعی تاجروں اور مسافروں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ غزنی سے دور دراز علاقوں میں بہترین بندوبست کر دیا جائے۔

محمود : (اپنی بات جاری رکھتے ہوئے): سلطان محمود آج تک اپنی حکومت کے تینتیس سالوں میں تیس سال تک مصروف رہا۔ کبھی بغاوتوں کی سرکوبی کے لیے تو کبھی جہاد کی نیت سے۔ بھارت پر سترہ حملے کئے گئے۔ مگر بغاوت ختم کر کے ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کیوں نہیں کیا۔

وزیر : میرے ذہن میں بھی عرصے سے یہی سوال ابھرتا رہتا ہے۔ آج اس کا جواب اس بی بی کی وجہ سے مل گیا''۔8

چوتھے اور آخری منظر میں صادقہ نواب نے سلطان محمود غزنوی کی سیاسی بصیرت اور اتباع اسلام کے شعور کے حوالے سے سلطان کی شخصیت کے داخلی و خارجی پہلوؤں

کوعمدگی کے ساتھ ابھارا ہے۔ بادشاہوں کے اس طرح کے کردار عصر حاضر کے انسانوں کوضرور عجوبہ لگتے ہیں کیوں کہ جمہوری حکومت میں موجودہ حکمرانوں کے لیے قدیم بادشاہوں کے کردار سبق آموز ہیں۔ منظر کا محل وقوع جنگل ہے اور ایک درخت کی ٹہنی پر الو بیٹھے ہوئے ہیں۔ سلطان کی نظر ان الوؤں پر پڑتی ہے۔

اسے لگتا ہے جیسے اُلو آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ سلطان تجسس کے عالم میں وزیر سے کہنے لگتا ہے۔

''محمود : وہ دیکھو درخت کی شاخ پر دو الو بیٹھے ہوئے ہیں' اگر تم پرندوں کی بولیاں واقعی سمجھتے ہو تو بتاؤ یہ الو آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔

وزیر : جہاں پناہ بہادر عموماً رحم دل ہوتے ہیں۔ اس کا ثبوت آپ ہیں۔ آپ نے ایسا دستور بنالیا ہے کہ جنگ میں گرفتار ہو کر آئے کسی بھی طبقے یا ذات کے لوگوں کو قتل نہ کروایا جائے' جن سے کچھ اندیشہ ہوا' انہیں آپ نے نگرانی میں دے دیا اور جن پر کوئی شبہ نہ ہوا' ان کو غلاموں میں شامل کرلیا۔

آپ کی خدمت میں غزنی' ہندوستانی غلاموں کی کثرت کی وجہ سے ہندوستان کا ایک شہر بنا ہوا ہے۔

محمود(مسکراکر) : اپنی بات کہنے کے لیے تمہید باندھ رہے ہو یا میری تعریف کے پل؟

وزیر(بات جاری رکھتے ہوئے) جن راجاؤں' بادشاہوں کو آپ نے جنگلوں میں مفتوح بنایا' انہیں بھی قتل کروایا بلکہ اکثر و بیشتر خراج کے عوض میں ان کا تاج انہیں واپس کر دیا۔ یہاں تک کہ پنجاب کے راجہ جے پال کو آپ نے تین بار شکست دی اور تینوں بار بغاوت ختم کروا کے حکومت اسے واپس کر دی۔ یہ اور بات کہ اپنے وطن کے رسم ورواج کے مطابق اسے خود کو آگ میں جلنا پڑا۔

محمود : وزیر محترم! سمجھ میں گیا الو جو کچھ کہہ رہے ہیں' میں ضرور سنوں گا۔تم بے خوف ہو کر سناؤ۔

وزیر : ان الو میں سے ایک کی بیٹی ہے' دوسرے کا بیٹا۔لڑکے کا باپ کہتا ہے کیا تم اپنی بیٹی کی شادی میرے بیٹے کے ساتھ کرنا چاہتے ہو تو تم کو پچاس گاؤں بیٹی کے جہیز میں دینے پڑیں گے۔

محمود : پھر بیٹی کے باپ نے کیا کہا؟

وزیر : جہاں پناہ! اس نے کہا خدا کے فضل سے جب تک ہمارا بادشاہ سلطان محمود حکومت کر رہا ہے ویران گاؤں کی کیا کمی' میں ضرور تمہیں پچاس گاؤں نہیں' پانچ سو گاؤں دے دوں گا۔

وزیر : (سلطان کو فکر مند دیکھ کر) سلطان' سیاسی باغیوں' ملحدوں اور ڈاکوؤں

کے اڈے بنے شہروں کو اجاڑنے اور پھر بسانے کا حکم دیا تھا' تاکہ امن
وامان کا گہوارہ بن سکیں اور گناہ گاروں کے ساتھ بے گناہوں کو نقصان
تو ہوگا ہی۔ عالی جاہ! آپ الوؤں کی باتوں کا بالکل خیال نہ کریں
الو تو الو ہی ہیں۔

محمود : الوؤں کی باتیں صحیح ہوں یا غلط لیکن اس میں شک نہیں کہ میرے مشیر
حکومت اور رعایا کے خیرخواہ ہیں' فرمان تیار کرو کہ آبادیوں کو ویران
کرنے کا کام فوراً بند کر دیا جائے اور ہاں کل دربار میں تمہارے
خطاب اور انعامات کا اعلان ہوگا۔9

مندرجہ بالا اقتباس یہ تاثر دکھایا گیا ہے کہ صادقہ نواب نے نہایت عرق ریزی' سوجھ بوجھ اور اپنے تاریخی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسے چست مکالمے تخلیق کیے ہیں کہ بربریت' درندہ صنعت اور جبر وتشدد کی تہمتوں کے باوجود باطنی حقائق کے پس پردہ سلطان محمود غزنوی کے اندر کے انسان میں بے پناہ مثبت اور روشن صفات موجود تھیں ۔جس کا انکشاف ہونے لگتا ہے۔ صادقہ نواب سحر نے اس ڈرامے کے ذریعہ سلطان محمود غزنوی کی انصاف کے پہلو کو ڈھونڈ نکالا ہے۔

صادقہ نواب سحؔر کے دیگر ڈراموں میں ڈاکٹر کفن پھاڑ' تین دو پانچ' باادب باملاحظہ ہوشیار شامل ہیں' جن میں مصنفہ نے طنز ومزاح کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے تاہم ان کا مکالماتی پہلو روشن ہے اور یہ ڈرامہ نگاری مثبت صفت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا

ہے کہ صادقہ نواب سحؔر ادبی دنیا میں اپنی شناخت بحیثیت ڈراما نگار اور بھی مستحکم کریں گی۔

''ظلم تو ظلم ہے'' دراصل ظلم کے مختلف رنگوں کو پیش کرنے والا ڈراما ہے۔ مظلوموں کے دکھ درد، سچ کی کھوج، اس کھون کا نتیجہ مایوس کن اور سچ اور جھوٹ کے فرض کی شناخت کا کھو جانا، انسانی نفسیات کی پیچیدگی کو یہ ڈرامہ کرداروں اور مکالموں کے ذریعہ پیش کرتا ہے اور زندگی کی ان کہی سچائیوں کو سامنے لاتا ہے۔

ڈراما ''اور گھنگرو بجتے رہے'' ...... یہ ڈراما کچی بستی کی سچی کہانی پیش کرتا ہے۔ اس میں دادا، نیتا، بچی اور دیگر کردار سماج کی نمائندگی کرتے ہیں اور کہانی میں رنگ بھرتے ہیں۔ یہ رنگ دکھ میں سکھ اور سکھ میں دکھ کی طبقاتی کشمکش کے پکے رنگ ہیں۔

ڈراما ''ڈاکٹر کفن پھاڑ'' مزاحیہ ڈرامہ ہے۔ اس کا مرکزی کردار جانوروں کا ڈاکٹر ہے مگر وہ انسانوں کا علاج کرنے لگتا ہے تو کیا ہوتا ہے کیسے کیسے مشکل کھڑے ہوتے ہیں ان کو بتایا گیا ہے۔ اس طرح ڈراما ''تین دو یا پانچ'' بھی ایک مزاحیہ ڈراما ہے جو اخبار کے ایڈیٹر اور اس کی بیوی کی تُو تُو مَیں مَیں پر مشتمل ہے۔ یہ ڈراما دراصل اخبار کے ایک ایڈیٹر اور ان کی بیوی کی نوک جھوک سے شروع ہوتا ہے پھر لطیفوں کا ایک سلسلہ چل پڑتا ہے۔ جس میں حاضر جوابی، تسلسل اور سوال جواب کی موزونیت لاجواب ہے۔ آج کے موجودہ مسائل میں کچھ وقت ہنسی مذاق مل جائے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہئے۔ اس ڈرامے کو پڑھ کر قاری بے پناہ قہقہے لگاتا ہوا دکھائی دے گا۔

''میرج بیورو'' بھی ایک طبع زاد مزاحیہ ڈراما ہے جہاں مختلف قسم کی دوشیزائیں

پیش کی گئی ہیں لیکن کوئی شادی طئے نہیں ہو پاتی اور مزاح کا ڈراپ سین ہو جاتا ہے۔

''ڈسکو کالج ممبئی'' بھی ایک طبع زاد مزاحیہ ڈرامے ہے۔اس میں نہایت دلچسپ انداز میں تمام مضامین ڈسکو کرتے ہوئے پڑھائے گئے ہیں۔اس کا لطف دیکھنے سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ڈسکو کالج کھولنے کا خیال کیوں آیا؟ دکھی رام چپراسی کے استفسار کرنے پر جواب نہایت پر لطف ہے۔

ان ڈراموں میں طنز کے تیر بھی ہیں اور مزاح کی چاشنی بھی۔

''سلطان محمود غزنوی'' ایک سنجیدہ اور تاریخی ڈراما ہے لیکن تاریخی ڈراموں سے ذرا سا مختلف ہے۔مصنفہ نے اس میں سلطان کے انصاف کا پہلو ڈھونڈ نکالا ہے جو عمدہ ہے۔

''باادب باملاحظہ ہوشیار'' ایک سماجی اصلاحی ڈراما ہے۔ بیٹے بیٹیوں کے ساتھ سلوک کے فرق کے منفی اثرات اس میں ظاہر کیے گئے ہیں۔''خودکشی یا موت'' شراب کی لت میں مبتلا شخص جو کہ جواری بھی ہے۔اس کی دردناک کہانی کا بھیانک انجام اس ڈرامے میں دکھایا گیا ہے۔

مجموعی طور پر اس کتاب کے سارے ڈرامے سماج میں موجود کئی مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ یہ موضوعات آج کی زندگی کے توجہ طلب موضوعات ہیں۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحؔر نے یہ ڈرامے لکھ کر اردو ڈرامے کے سرمائے میں خوشگوار اضافہ کیا ہے۔

ڈراما ''ظلم تو ظلم ہے'' طبع زاد ایک بابی ڈراما ہے۔اس ڈراما میں انسانی نفسیات

کی اس کیفیت کو بیان کیا گیا ہے کہ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو انسان کا اعتبار انسان سے ہٹ کر جانوروں پر ہو جاتا ہے جیسا کہ اس ڈرامے کا کردار ظالم سنگھ کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔

تیسرے اور آخری منظر میں سیلاب کی تباہی دکھائی گئی ہے۔ ایک چھوٹی سی کشتی میں ظالم سنگھ' آتما رام اور کچھ سامان اور اپنے کُتے کو لے کر سوار ہو جاتے ہیں کہ ایک عورت ایک بچہ لے کر سوار ہونے کی منت کرتی ہے۔ ظالم سنگھ کے منع کرنے کے باوجود آتما رام سارا سامان پھنک کر اسے سوار کر لیتا ہے' اس کی جان بچالیتا ہے۔ اب یہ راز کھلتا ہے: ''عورت: میں ظالم سنگھ کی بیوی ہوں وہ مجھے بے وفا سمجھتا ہے۔ یہ بچہ اسی کا ہے۔ مگر اب وہ اسے کیوں قبول کرے گا۔ اصل میں وہ دل کا بڑا نرم اور بھولا ہے۔ صرف باہر سے سخت دکھائی دیتا ہے......''

آتما رام : لوگوں سے دھوکا کھا کھا کر اس کا انسانوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے بیچارہ!

جاگیر : ماں کی بے وفائی نے اس کی دنیا اجاڑ دی ورنہ......شاید وہ ساری دنیا کی بے وفائی کو سہہ لیتا......'' 10؎

اس آخری مکالمے نے ماں کے کردار پر کئی اہم سوال کھڑے کئے ہیں کہ محبت کا پہلا سر چشمہ جب خشک ہو جاتا ہے تو بچہ کی تشنگی کہیں سے سیراب نہیں ہو سکتی۔

دو ضمنی کرداروں کی مدد سے آسان' مختصر مکالموں' چند بلاکس اور روشنیوں کی مدد

سے اس ڈرامے کو آسانی سے اسٹیج کیا جا سکتا ہے۔

''اور گھنگرو بجتے رہے'' ڈرامہ میں تپو ایک سیٹھانی کے گھر میں ملازم ہیں۔ ان کی ایک بیٹی بندیا ہے جسے یہ لوگ مالک کے بچوں کی طرح انگریزی اسکول اور ڈانس سکھا کر مقابلے پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری جانب جھونپڑ پٹی کی معاشی اور معاشرتی مجبوریاں حائل ہیں۔ لنگڑ دادا ایک فلیٹ کا وعدہ کر کے تین سال سے روپیے اینٹھ رہا ہے۔ بابو نیتا ہے جو کہ کٹورا اور کمبل بانٹ کر الیکشن جیت رہا ہے۔ لنگڑ دادا نے کلوا جیسے لوگوں کو پال رکھا ہے جو کہ چار سال کی معذور بچی' بے بی' کی عصمت دری کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ ان حالات میں نندی سیٹھ کے بچوں کی طرح کیسے پروان چڑھ سکتی ہے؟ یہ طبقاتی کشمکش بڑھتی جاتی ہے۔ ایسے سوال جنم لیتے ہیں:

نندی : دادا یہ بے بی کی جگہ میں ہو سکتی تھی نا؟ پریما' رنکو' ریٹا کوئی بھی ہو سکتی تھی نا؟ (دادا کا کالر پکڑا) کلوا کی جگہ تو بھی تو ہو سکتا تھا نا؟...... بول ...... بول...... بول نا......'' چند کرداروں کی مدد سے اسے بآسانی اسٹیج کیا جا سکتا ہے۔ اس کا تاثر بہت گہرا اور دیرپا ہے۔

دادا : (گھبرا کر اور شرمندہ ہو کر کالر چھڑاتے ہوئے) چل ہٹ! اُپن ایسا نہیں ہے۔

نندی : ہماری جھونپڑ پٹی۔ غریب کی جھونپڑ پٹی۔ ایک لات سے دروازہ گر پڑے! ہمارے ماں باپ پیٹ کر بھاگتے رہتے ہیں۔ کون رکشا کرے

گا ہماری......؟ غریب کی لڑکی کی جوانی تو کچھ سکوں میں خرید ی جاسکتی ہے۔اور پھر یہ بچی......جنگلی......جنگلی......تو کیا بچائے گا ہم کو......تجھ جیسے لوگوں سے بچائے کوئی ہم کو......(بی بی کی ماں کا داخلہ)11؎

ڈراما ''ڈاکٹر کفن پھاڑ'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' ایک بابی مزاحیہ ڈراما ہے۔لطف کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر جانوروں کا ہے لیکن جانوروں کم بیمار پڑتے ہیں اس لیے وہ انسانوں کا علاج کرنے کی ٹھان لیتا ہے اور بڑے عجیب وغریب مریضوں سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔مرض کی صحیح طور پر تشخیص بھی نہیں کر پاتا اور اسے فیس بھی وصول نہیں ہوتی۔اس ڈرامہ کا لطف پڑھنے سے زیادہ اسٹیج پر دیکھنے سے ملتا ہے۔

''تین دو پانچ'' طبع زاد' ایک بابی مزاحیہ ہے۔جو اخبار کے ایک ایڈیٹر اوران کی بیوی کی نوک جھونک سے شروع ہوتا ہے پھر لطیفوں کا ایک سلسلہ چل پڑتا ہے۔حاضر جوابی' تسلسل اورسوال جواب کی موزونیت لا جواب ہے۔آج کے مسائل سے بھرے ہوئے دور میں کچھ وقت ہنسی مذاق کا مل جائے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہئے بلکہ نعمت سمجھ کر محضوظ ہونا چاہئے۔یہ ڈراما ہمیں بے پناہ ہنسی اور مسرت سے دوبالا کر دیتا ہے۔اگر یہ ڈراما اسٹیج کی زینت بنے تو ہنسی میں چار چاند لگ جائیں گے۔

اسی طرح ڈراما ''میرج بیورو'' بھی ایک بابی' طبع زاد مزاحیہ ہے۔میرج بیورو میں مختلف قسم کی دوشیزاؤں کی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔اس کے باوجود کسی دوشیزہ کی مناسب لڑکے کے ساتھ شادی طئے نہیں ہو پاتی اور یہ میرج بیورو بند ہو جاتا ہے۔اس ڈرامے میں بھی سماج کے موجودہ حالات جہاں جہیز جیسی لعنت روز بہ روز زور پکڑ رہی

ہے اس پر بھر پور طنز کیا گیا ہے۔ ''ڈسکو کالج ممبئی'' بھی ایک طبع زاد مزاحیہ ڈراما ہے۔ اس میں نہایت دلچسپ انداز میں تمام مضامین ڈسکو کرتے ہوئے پڑھائے جاتے ہیں۔ اس ڈسکو کالج ممبئی کا بھر پور لطف ہمیں پڑھنے سے نہیں بلکہ ڈراما اسٹیج کر کے دیکھنے پر حاصل ہوتا ہے۔

''رنگ برنگا بھارت میرا'' بچوں کے لیے لکھا گیا ایک بہترین ڈراما ہے۔ اس میں آپسی بھائی چارہ، ہمدردی، اتفاق واتحاد کا پیغام بچوں کو دیا گیا ہے جو آج کے بڑھتے ہوئے تعصب پسند سماج پر ایک طمانچہ ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ تمام ڈرامے اصلاح معاشرہ کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ڈراموں میں ان کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکالمے بہت خوب ہیں۔ کردار نگاری کی اپنی مثال آپ ہے۔ مجموعی اعتبار سے صادقہ نواب سحر کے ڈرامے برائے فن اور برائے زندگی بھی ہے۔

حوالے

1۔ مکھوٹوں کے درمیان،از:ڈاکٹر شہناز صبیح،ص:9

2۔ دیا جلے ساری رات،ص:19

3۔ دیا جلے ساری رت،ص:19

4۔ دیا جلے ساری رات،ص:20

5۔ صادقہ نواب سحر کے ڈرامے ایک تعارف،شہناز صبیح،ص:10,11

6۔ ڈراما سلطان محمود غزنوی،ص:182

7۔ ڈراما محمود غزنوی،ص:185,186

8۔ ڈراما محمود غزنوی،187,88

9۔ ڈراما محمود غزنوی،ص:85,86,87

10۔ ڈراما ''ظلم تو ظلم ہے''،ص:91

11۔ ڈراما ''اور گھنگھرو بجتے رہے''،ص:101

مجموعی جائزہ

مجموعی جائزہ

صادقہ نواب سحر 8اپریل 1957ءکوآندھراپردیش کےصوبہ گنٹور میں پیدا ہوئیں ۔ان کا حقیقی نام صادقہ آراء ہے ۔صادقہ ابھی صرف چار ماہ کی ہی تھیں کہ گنٹور کا علاقہ فسادات کی زد میں آ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ لوگ ممبئ کا رخ کیئے اور وہیں کے ہو رہے۔ صادقہ نواب سحر کی ابتدائی تعلیم انجمن اسلام طیب جی ہائی اسکول ناگپاڑہ اورامام باڑہ ممبئ سے مکمل ہوئی ۔ 1974 ء میں ایس ایس سی کامیاب کیا ۔ 1978ءمیں بی اے آنرس صوفیاء کالج ممبئ سے اردواور فارسی کے مضامین کے ساتھ درجہ اوّل میں کامیاب کیا۔ بعدازاں ممبئ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیااور 1985ء میں ہندی سے ایم اے کیا اور یونی ورسٹی رینکر بھی رہیں ۔ایم اے اردو میں فرسٹ کلاس درجہ حاصل کیااوراپنی ملازمت کا آغاز برہانی کالج ممبئ سے کیا۔ برہانی کالج میں ملازمت کے دوران انہوں نے جونیئر کالج ٹیچر کا ڈی ۔ایچ ۔ای کورس بھی مکمل کرلیا اور ڈاکٹر آدم شیخ کی نگرانی میں اردوانشائیہ پر پی ایچ ڈی میں داخلہ بھی لیا۔ بعدازاں کھپولی کے (کے ایم سی کالج) میں مستقل ملازمت اختیار کرلی اور تاحال شعبہ ہندی میں اسوسی ایٹ پروفیسر وصدر شعبہ کے باوقار عہدہ پر فائز ہیں ۔

صادقہ نواب سحر افسانہ نگاری کے علاوہ' ڈراما نگاری' شاعری' ترجمہ نگاری اورادب اطفال میں بھی طبع آزمائی کی ہیں اور تقریباً ان سبھی اصناف پر ان کی کتابیں

منظر عام پر آ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

شخصیت انسان کی ظاہری و باطنی خصوصیات کا مجموعہ ہوتی ہے جس میں انسان کی سیرت و کردار، عادات واطوار، چال ڈھال، پہنوا، اخلاق واحساس وغیرہ شامل ہیں۔

صادقہ نواب سحر کی شخصیت میں بھی ظاہر و باطنی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اپنے اطراف واکناف کا ماحول بڑی حد تک اثر انداز ہے۔ ان کی شخصیت بڑی ہمہ جہت ہے اور اپنے قارئین کو اپنی جانب مکمل طور سے متوجہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر خوش مزاج، خوش اخلاق خاتون ہیں۔ مزاج میں بناوٹ بالکل بھی نہیں ہے۔ سیدھی سادھی شخصیت کی حامل ہیں۔ ہمہ وقت ان کے چہرے پر ایک تبسم کھلا رہتا ہے۔ اُن کا تبسم سے لبریز چہرہ چمکتی آنکھیں شفاف ذہن کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہی اوصاف انکساری ہے جو اُن کی تحریروں میں بھی نظر آتے ہیں۔

صاقہ نواب سحر ایک بہترین فنکارا ہونے کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کے اعلیٰ عہدہ پر فائز بھی ہیں۔ انسانوں کی قدرداں بھی ہیں۔ انسانی جذبات کو سمجھنے والی، دلوں کو پرکھنے والی، انسانی نفسیات کو بخوبی سمجھنے کا ہنر جانتی ہیں۔ رشتوں کو خوب نبھاتی ہیں۔ خوشگوار زندگی گذارنا اور نبھانا اُن کا مقصد حیات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی اکثر تخلیقات میں عصر حاضر کے حالات وواقعات کے علاوہ خواتین پر ظلم و جبر اور ان کی حق تلفی پر نہ صرف سوالات اٹھاتی نظر آتی ہیں بلکہ خواتین اور سماج کو اپنی تحریروں کے ذریعہ حوصلہ بھی بخشتی ہیں۔

ناول لفظوں کا فن ہے۔ ناول لکھنے والا ناول کے کرداروں کو زندگیوں کے ذریعہ

کچھ اس طور پر پیش کرتا ہے کہ وہ بڑی حد تک حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔

ناول میں زندگی کو ایک خاص فنکارانہ طریقے سے پیش کیا جاتا ہے اس لیے وہ کئی اعتبار سے اپنے قاری کو یہ بھی پڑھنے کے لیے اکساتا ہے۔

ناول جن کرداروں کو ان کی مختلف خصوصیات کے ساتھ پیش کرتا ہے، ہمیں اکثر اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس قسم کے کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ بعض کردار نسبتاً پیچیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اندر زندگی کی قوت کا احساس ہوتا ہے جو انہیں ہمہ وقت سرگرم رکھتی ہے۔ اس قسم کا کردار ایک خاص ماحول کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے اور اپنے موافق ایک ماحول بھی پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے انسان ہونے یعنی ایک ایسی زندہ ہستی کا تاثر فراہم کرتا ہے جو متاثر بھی کرتا ہے اور دوسروں پر اثرانداز بھی ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک اہم کردار اکیسویں صدی میں تخلیق ہوا جسے صادقہ نواب سحر نے اپنے ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کے ذریعہ متعارف کروایا۔

صادقہ نواب سحر نے 2008ء میں کہانی کوئی سناؤ متاشا کے عنوان سے اپنا پہلا ناول لکھا جس کی طرف لوگوں کی بے پناہ توجہ ہوئی۔ ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' ایک منفرد اسلوب کا ناول ہے۔ اس ناول کو سوانح ناول قرار دیا گیا ہے۔ اس ناول کا ایک اہم کردار متاشا ہے جس کی زندگی کے حالات ابتداء سے آخر تک بیان کیئے گئے ہیں۔ زندگی کے حالات بیان کیے گے ہیں۔ پورا ناول متاشا کی زندگی کے تلخ واقعات سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں صادقہ نواب سحر نے ناول کے فن کی خوبیوں کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ موضوع کا انتخاب سادہ لیکن حقیقی ہے اور جذباتی بھی، خاص طور پر متاشا کے کردار

کے بیان میں انہوں نے درد اور کرب کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ قارئین کو متاشا کے کردار کے ساتھ بے پناہ ہمدردی ہو جاتی ہے۔

اس ناول میں عورت کے استحصال کی مختلف صورتیں دکھائی گئی ہیں۔ ناول کے تمام کرداروں میں ''متاشا'' سب سے مضبوط کردار بن کر سامنے آتی ہے۔ وقت کی تیز رفتاری اور حالات کی بے رحمی کے آگے متاشا کا زندگی کی نشیب وفراز سے سامنا کرنا اس ناول کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ وہ زندگی کو بکھرنے کے بجائے سمٹنا چاہتی ہے۔اس کے یہاں مشرقی عورت کی وہ تمام خوبیاں اور روایتی کمزوریاں موجود ہیں جسے وہ اپنی نسائی فطرت کے بدولت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ متاشا زندگی کی حقیقتوں سے اس طرح ہمکنار ہوتی ہے کہ صحیح معنوں میں ایک مشرقی عورت کی مثال بن کرسامنے آتی ہے۔ یہاں پر صادقہ نواب سحر نے مشرقی عورت کا تقدس، خدمت گذاری، ایثاروقربانی اور وفا شعاری کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

متاشا کی زندگی کی روداد سے قاری کے ذہن میں کئی سوال ابھرتے ہیں۔ جوسماج، اخلاق اور انسانیت سے متعلق ہیں۔ ناول کا سب سے کربناک پہلو یہ ہے۔ متاشا جوانی کے اوائل عمری میں اپنے بعد کے دوست موریشور کا کا کی ہوس کا جب شکار ہوتی ہے اور یہیں سے اُس کی ذہنی رفتار میں تبدیلی آنے لگتی ہے اور یہیں سے اُسے مرد آدمیوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔

صادقہ نواب سحر کا دوسرا ناول ''جس دن سے'' ہے جو 2016ء میں منظرعام پرآیا۔ یہ ناول ایک نفسیاتی ناول ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار جگدیش نامی لڑکا

ہے۔جس کا بچپن اپنے ماں باپ کے ساتھ گذرا لیکن ماں باپ کی آپسی نااتفاقیوں کی وجہ سے اِس گھر کے افراد کو بچھڑنا پڑا۔دراصل جیتو کا باپ جنسی خواہشات کا حامل انسان ہے، جس کی وجہ سے اس کی ماں آئے دن کے جھگڑوں کی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔اس ناول اور خاندان کے بکھر جانے کے بارے میں رتن سنگھ لکھتے ہیں:

> ''کوئی پریوار ٹوٹ پھوٹ کی کگار پر ہوتو زندگی بکھر جاتی ہے۔اس کی صورت بگڑ جاتی ہے اور اس کی راہوں میں کانٹے اس طرح بچھ جاتے ہیں کہ صرف پاؤں ہی نہیں، جسم ہی نہیں، انسان کی روح بھی لہولہان ہوتی رہتی ہے۔''

مجموعی طور پر جس دن سے ناول ایک ایسا ناول ہے جس میں جدت بھی ہے اور روایتی انداز بھی اور یہ بھی محسوس کیا جاسکتا ہے کہ واقعات اور کرداروں کے ذریعہ صادقہ نواب سحر نے موجودہ زمانہ کے حالات کو بڑی خوبی کے ساتھ اس ناول میں پیش کیا ہے۔

صادقہ نواب سحر کے افسانوں کا مزاج ایک دوسرے مختلف ہے جن میں مقامی کلچر اور زبان و بیان کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے اوران علاقوں کی تہذیب وتمدن کو بھی مکالموں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔

صادقہ نواب سحر اردو فکشن کی دنیا میں ایک ابھرتا ہوا نام ہے جہاں انہوں نے ناول اورافسانے لکھے وہیں صنف ڈراما نگاری میں بھی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کولوہا منوایا۔''مکھوٹو کے درمیان'' صادقہ نواب سحر کے ڈراموں کا مجموعہ ہے جو 2012ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعہ کے کئی ڈرامے اسٹیج بھی ہوئے اور داد تحسین

بھی حاصل کی۔تقریباً تمام ڈرامے سماجی اورنفسیاتی مسائل کے آئینہ دار ہیں جو کہ ڈراما نگار کی حساس طبعیت کوظاہر کرتے ہیں وہ انسانیت میں یقین رکھتی ہیں،قلم کے ذریعہ سماج کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔عورت کی مظلومیت اور استحصال کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔

مجموعی اعتبار سے ان کے ڈرامے صنف ڈراما نگاری میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔فہرست کے اعتبار سے ڈراما ''دیا جلے ساری رات'' پہلا ڈراما ہے اس ڈرامے میں انہوں نے بچوں کی نافرمانی کو بیان کیا ہے۔ڈراما ''ظلم تو ظلم ہے'' میں انسانوں کواذیت دینا اور جانوروں کے ساتھ پیار ومحبت کرنا پیش کیا گیا ہے۔اس مجموعہ کا ایک اہم ڈراما ''سلطان محمود غزنوی'' پر لکھا گیا ہے۔

مزاحیہ ڈراما میں کفن پھاڑ، تین دو پانچ، میرتیج بیورو اور ڈسکو کالج ممبئی شامل ہیں جو قاری کو بھر پور طریقے سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ڈاکٹر شہناز صبیح ان کے ڈراموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''بحیثیت مجموعی یہ ڈرامے صادقہ نواب سحر صاحبہ کی اصلاح معاشرہ کی خواہشوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں اسٹیج کرکے عوام میں بیداری کی لہر پیدا کی جائے، ناامیدی کے مایوس مطلع پر کہیں سے امید کی کوئی کرن چمکے جوانسانیت کوزندہ کردے۔''

کتابیات

کتابیات

بنیادی کتب

سلسلہ نمبر	مصنف کا نام	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سن اشاعت
1	صادقہ نواب سحر	انگاروں کے پھول شعری مجموعہ	دہلی	1996ء
2	// //	پھول سے پیارے جگنو (بچوں کی نظموں کا مجموعہ)	دہلی	2003ء
3	// //	کہانی کوئی سناؤ متاشا (ناول)	دہلی	2008ء
4	// //	جس دن سے (ناول)	دہلی	2016ء
5	// //	مکھوٹوں کے درمیان (اردو کا طبع زاد ڈرامائی مجموعہ)	دہلی	2012ء
6	// //	خلش بے نام سی (افسانوں کا مجموعہ)	دہلی	2013ء
7	// //	پیچ ندی کا مچھیرا	دہلی	2018ء

ثانوی کتب

سلسلہ نمبر	مصنف کا نام	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سن اشاعت
8	ابواللیث صدیقی	اردو افسانہ آج کا اردو ادب	دہلی	1975ء
9	احمد صغیر	اردو افسانہ کا تنقیدی جائزہ 1980ء کے بعد	دہلی	2009ء
10	اسلم جمشید پوری	جدیدیت اور اردو افسانہ	دہلی	2011ء
11	ترنم ریاض	بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب	دہلی	2014ء
12	سلیم شہزاد	قصہ جدید افسانہ کا	مہاراشٹرا	1989ء
13	شائستہ فاخری	اداس لمحوں کی خودکلامی	دہلی	2011ء
14	شائستہ فاخری	صدائے عندلب بر شاخ شب	دہلی	2014ء
15	شائستہ فاخری	وصف پیغمبری نہ مانگ	دہلی	2016ء

16	شمس الرحمٰن فاروقی	افسانہ کی حمایت میں	دہلی	2006ء
17	صادقہ نواب سحر	شخصیت اور فن فکشن کے تناظر میں	دہلی	2017ء
18	صغیر افراہیم	اردو افسانہ ترقی پسند تحریک	علی گڑھ	2009ء
19	غضنفر اقبال	اردو افسانہ 1980ء کے بعد	دہلی	2006ء
20	فردوس فاطمہ	مختصر افسانہ کا فنی جائزہ	الہ آباد	1975ء
21	فرمان فتح پوری	اردو فکشن کی مختصر تاریخ	دہلی	2014ء
22	فرمان فتح پوری	اردو فکشن کی مختصر تاریخ	دہلی	2014ء
23	کلیم الدین احمد	اردو تنقید پر ایک نظر	پٹنہ	1983ء
24	گوپی چند نارنگ	نیا اردو افسانہ	دہلی	2010ء
25	محمد مرتضیٰ	اردو افسانہ میں خواتین کا حصہ	دہلی	2015ء
26	مشتاق صدف	اردو کی خواتین فکشن نگار	دہلی	2014ء
27	مہدی جعفر	نئے افسانہ نیا دستخط	دہلی	1993ء
28	مہدی جعفر	عصری افسانہ کا فن	دہلی	1998ء
29	وقار عظیم	فن افسانہ نگاری	دہلی	1977ء
30	// //	نیا افسانہ	دہلی	1977ء

رسائل

1	آج کل	نئی دہلی	جنوری	2009ء
2	اسباق	پونہ	جولائی	2017ء
3	ایوان اردو	دہلی	ڈسمبر	1989ء
4	سب رس	حیدرآباد	مارچ	2016ء
5	شاعر	ممبئی	مارچ	2012ء
6	شعر وحکمت	حیدرآباد	مئی	2002ء

7	نیادور	لکھنو	اگست	2017ء
8	قومی زبان	حیدرآباد	فروری	2012ء
9	اردودنیا	دہلی	اکتوبر	2016ء

انٹرویو

1۔ صادقہ نواب سحر بذریعہ ٹیلی فون

2۔ شائستہ فاخری بذریعہ ٹیلی فون

3۔ قمر جمالی بذریعہ ٹیلی فون

4۔ پروفیسر بیگ احساس............